ملّتِ اِسلامیہ کا عِلمی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

مُحدّث

لاہور
پاکستان

مُدیرِ اعلیٰ

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ

407 | نومبر 2026ء / جمادی الاولیٰ 1448ھ

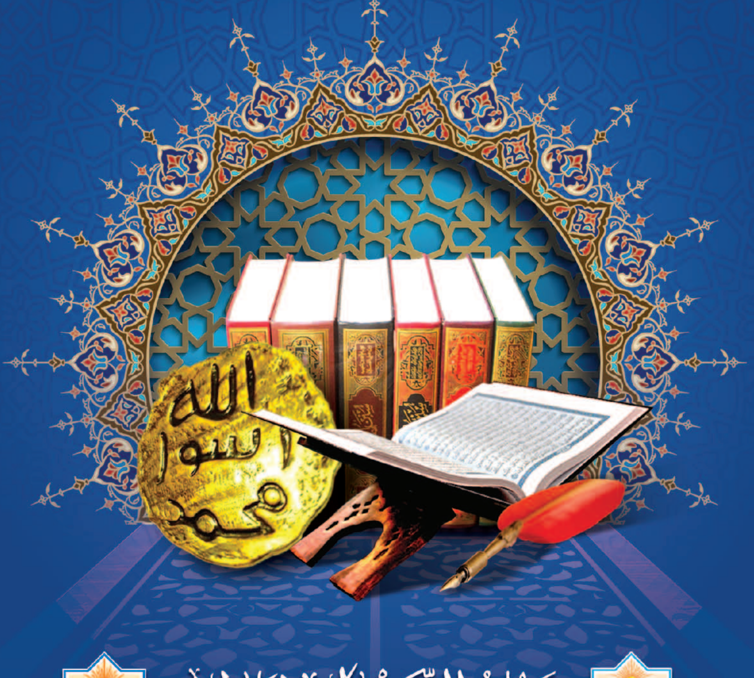

مجلس التحقیق الاسلامی

جلس التحقیق الاسلامی
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL
PAKISTAN

جامعۃ لاہور الاسلامیۃ
پاکستان

اعلان داخلہ

Session Fall 2026

النور
AL NOOR CENTER

جامعۃ لاہور الاسلامیہ

کے شعبہ

Lahore Institute For Social Sciences

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے الحاق شدہ

چار سالہ درس نظامی + بی ایس پروگرام

ریگولر کلاسز (برائے طلباء وطالبات)

بنیادی اہلیت
ایف اے یا شہادۃ خاصہ

عالیہ/بی اے کی سند کے حاملین کے لیے ڈائریکٹ 5th سمسٹر میں داخلہ جاری ہے۔

نمایاں خصوصیات

- ورکنگ پروفیشنلز کے لیے شام کی کلاسز
- کلاس کی ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگز سے استفادہ
- عرب اور پاکستانی یونیورسٹیز کے فاضل اساتذہ
- وفاق المدارس کی ڈگری حاصل کرنے کا موقع
- مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کا موقع
- انتہائی مناسب فیس

LAHORE INSTITUTE FOR SOCIAL SCIENCES

Registration Form Link

https://forms.gle/BjACMrjPiKUdYMQWA

ڈاکٹر حافظ انس مدنی
PRINCIPAL LISS
مدیر مرکز النور

0329 8472971
03411110370

بیت العتیق کیمپس، جمال چوک
خیابان جناح نزد نشیمن اقبال فیز ون، لاہور

مِلّتِ اِسلامیہ کا عِلمی اور اصلاحی مجلّہ

مُحدّث

لاہور پاکستان

مُدیر اعلیٰ: ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی رحمہ اللہ

مُدیر: ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی

جلد 57 | نومبر 2026ء / جمادی الاولیٰ ۱۴۴۸ھ | عدد 06

مجلس مشاورت: ▪ مولانا ارشاد الحق اثری ▪ حافظ عبد الستار حماد ▪ مولانا محمد شفیق مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ حسن مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر ▪ ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام ▪ ڈاکٹر جواد حیدر ▪ ڈاکٹر آصف جاوید

فہرستِ مضامین

اداریہ	حوثی–سعودی تنازع؛ جڑیں، اسباب اور ممکنہ حل	انجینئر عتیق الرحمن کیلانی	4
اداریہ	تحفظ حرمین شریف سیمینار	علامہ ابتسام الٰہی ظہیر	12
فکرومنہاج	غلو اور انتہا پسندی کے بعض مظاہر	حافظ خضر حیات	18
فکرومنہاج	مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ: افکار و نظریات	ڈاکٹر حافظ محمد زبیر	38
تبصرہ کتاب	''اقتضاء الصراط المستقیم'' از امام ابن تیمیہ	ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری	69
تبصرہ کتاب	'مقالات عقیدہ ومنہج؛ تعارف و تجزیہ'	ڈاکٹر آصف جاوید	78
احوال الجامعہ	سالانہ تقریب تقسیم اسناد و انعامات	قاری ظہیر ادریس	83
سوانح حیات	حافظ محمد ادریس رحمہ اللہ	ڈاکٹر حافظ فہد اللہ مراد	92
وفیات	مولانا محمد یحییٰ جلال پوری رحمہ اللہ	مولانا ذاکر رفیق	96

مدیر معاون
عبد الرحمن عزیز
0308-4131740

مینیجر
محمد اصغر
0305-4600861

زرسالانہ =/1200 روپے
فی شمارہ =/200 روپے

بیرون ملک
زرسالانہ =/30 ڈالر
فی شمارہ =/5 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

مُحدّث کتاب و سُنّت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں!

حوثی۔سعودی تنازع؛ جڑیں، اسباب اور ممکنہ حل

حوثی۔سعودی تنازع، مشرقِ وسطیٰ کے پیچیدہ ترین تنازعات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ محض سعودی عرب اور حوثی تحریک کے درمیان ایک فوجی کشمکش نہیں، بلکہ اس کے پیچھے یمن کی داخلی سیاسی تقسیم، اقتدار کی کشمکش، معاشی مسائل، علاقائی طاقتوں کے مفادات، سعودی عرب کی سرحدی اور قومی سلامتی کے خدشات اور ایران کے ساتھ علاقائی مسابقت جیسے متعدد عوامل کار فرما ہیں۔ یمن میں حوثی تحریک نے ۲۰۱۴ء میں دارالحکومت 'صنعاء' پر کنٹرول حاصل کیا، جس کے بعد اِس بحران نے ایک بڑی جنگ کی شکل اختیار کی۔ مارچ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب کی قیادت میں ایک اتحادی فوج نے یمن میں مداخلت کی۔

یہ تنازع نہ مذہبی یا فرقہ وارانہ کشاکش ہے اور نہ سعودی عرب اور حوثی تحریک کے درمیان فوجی کشمکش، بلکہ اس کے پیچھے یمن کی داخلی، قبائلی اور سیاسی تقسیم، اقتدار کی کشمکش، معاشی مسائل، علاقائی طاقتوں کے مفادات، سعودی عرب کی سرحدی اور قومی سلامتی کو لاحق خدشات کے علاوہ ایران کی حوثیوں کو فراہم کردہ سیاسی اور عسکری حمایت جیسے عناصر شامل ہیں، جنہوں نے تنازع کو علاقائی سطح پر مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔

یمن کے بارے میں قرآنی اشارات

سورۃ الفیل میں اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کا ذکر کیا ہے، جو بیت اللہ کو گرانے کے لیے آیا تھا۔ اہلِ صنعاء کی نظر میں اہلِ مکہ کی کیا وقعت تھی، وہ اُس کے اِس حملے سے واضح ہے۔ اہلِ صنعاء اہلِ مکہ کو اس قدر حقیر خیال کرتے تھے کہ بیت اللہ کو گرانے کے لیے لشکر کشی کر دی۔

یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے سال ۵۷۱ء کو پیش آیا۔ اور یہ حملہ اس نے ملک حبشہ کی پراکسی کے طور پر کیا۔

سورۃ النمل میں ارشاد ہے: ﴿نَحْنُ أُولُوا قُوَّةٍ وَّ أُولُوا بَأْسٍ شَدِيْدٍ﴾ [النمل: ۳۳]

"ہم بڑے طاقتور اور سخت جنگجو ہیں۔"

یہ سیدنا سلیمان ؑ کا زمانہ ہے جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح ہے۔ اور یہ علاقہ 'سبا' کا ہے جو صنعاء سے

قریباً ۷۰ کلو میٹر مارب کی طرف ہے۔

سورۃ سبا میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ۝۱۵﴾ [سبأ: ١٥]

"قومِ سبا کے لیے ان کے مسکن میں ہی ایک نشانی موجود تھی۔ اس مسکن کے دائیں بائیں دو باغ تھے (ہم نے انھیں کہا تھا کہ) اپنے پروردگار کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ پاکیزہ اور ستھرا شہر ہے اور معاف فرمانے والا پروردگار۔"

قرآن کریم کے تین مقامات سے میں نے آیات ذکر کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یمن خوشحال، متمدن، اور خود سر قسم کے لوگ تھے۔ اسی زمانے میں اہل حجاز معاشی طور پہ کمزور، غیر متمدن اور بدو قسم کے لوگ تھے۔

مسلمان ہونے کے بعد بھی ان کے لاشعور سے یہ سوچ مکمل طور پہ ختم نہ ہو سکی اور ان کا طرزِ عمل اس سوچ کا عکاس معلوم ہوتا ہے۔

حوثی تحریک کا پس منظر

حوثی تحریک، جسے "انصار اللہ" بھی کہا جاتا ہے، یمن کے شمالی علاقوں میں ایک مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریک کے طور پر ابھری۔ اس تحریک کا تعلق بنیادی طور پر زیدی شیعہ برادری سے ہے، جو شمالی یمن کے بعض علاقوں میں تاریخی طور پر مضبوط رہی ہے۔ حوثی تحریک کی سیاسی سرگرمیاں ۲۰۰۰ء کی دہائی کے آغاز میں نمایاں ہوئیں اور اس نے صدر علی عبد اللہ صالح کی حکومت کی پالیسیوں کی مخالفت کی۔ یاد رہے کہ علی عبد اللہ صالح بھی زیدی شیعہ ہے۔

زیدی شیعہ ۱۲ اماموں کو نہیں مانتے اور صحابہ دشمنی میں بھی 'اثنا عشری شیعہ' سے کم درجہ کی عداوت رکھتے ہیں، تاہم اس تحریک کا بانی بدر الدین حوثی ہے جس نے اس تحریک کی ابتداء 'صعدہ' سے کی۔

اس نے زیدی مذہب کے احیاء کے نعرے تلے ایرانی خمینی انقلاب کی نقل کا ارادہ کیا اور ۱۹۹۷ء اور ۲۰۰۳ء کے دوران ایران چلا گیا۔ اسی دوران ایرانی خمینی انقلاب کا اثر بدر الدین پہ گہرا ہو گیا۔ اب یہ تحریک انقلابِ خمینی ہی کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔

۲۰۱۱ء میں عرب دنیا میں عوامی احتجاج کی لہر (Arab Spring) یمن تک پہنچی۔ صدر علی عبد اللہ صالح

کو اقتدار چھوڑنا پڑا اور ان کے نائب عبدربہ منصور ہادی نے عبوری طور پر اقتدار سنبھالا۔ خلیجی تعاون کونسل کی نگرانی میں سیاسی انتقال اقتدار کا ایک منصوبہ بنایا گیا، جبکہ اقوام متحدہ کی حمایت سے قومی مذاکرات کا عمل بھی شروع ہوا۔

تاہم یہ سیاسی عمل یمن کے تمام فریقوں کے درمیان اقتدار، آئینی نظام، علاقائی خودمختاری اور وسائل کی تقسیم کے مسائل حل نہ کر سکا۔ قومی مذاکرات کے اختتام تک متعدد اہم اختلافات برقرار رہے۔ اس سیاسی کمزوری نے حوثی تحریک کو اپنے اثرورسوخ میں اضافے کا موقع فراہم کیا۔

۲۰۱۴ء میں حکومت کی جانب سے ایندھن کی قیمتوں میں اضافے کے بعد حوثیوں نے بڑے پیمانے پر احتجاج کیا۔ انہوں نے قیمتوں میں کمی اور سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران حوثی جنگجوؤں نے صنعاء میں اپنا اثر بڑھایا اور بالآخر دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ ۲۰۱۵ء کے آغاز میں صدر ہادی کی حکومت شدید دباؤ میں آگئی اور ہادی سعودی عرب چلے گئے۔

کیا یہ شیعہ سنی تنازع ہے؟

اس کا سادہ اور براہِ راست جواب ہے کہ "جی ہاں یہ شیعہ سنی تنازع ہے" اور اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ "جی نہیں یہ شیعہ سنی تنازع نہیں ہے" بلکہ اپنے مفادات اور علاقائی کنٹرول حاصل کرنے کی جنگ ہے۔

آئندہ سطور میں، میں یہ وضاحت کروں گا کہ یہ دونوں موقف کیسے درست ہیں۔

ایران نے حماس کو اپنی پراکسی بنایا حالانکہ وہ سنی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایران اپنے مفادات کے لیے جس کسی کو استعمال کر سکے کر لیتا ہے۔ اسی طرح حوثیوں میں سنی بھی موجود ہیں۔

دوسری جانب اگر پاکستان کے تناظر میں دیکھیں تو انڈیا واضح طور پہ طالبان کو پاکستان کے خلاف بطور پراکسی استعمال کر رہا ہے حالانکہ طالبان سنی ہیں اور پاکستان بھی سنی ہے۔ مگر چائنہ جو مشرک لوگ ہیں، ان کی پاکستان سے لازوال دوستی ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ شیعہ سنی نے اس تنازع میں کیا گل کھلائے ہیں؟

۲۰ ستمبر ۲۰۱۴ء کو علی رضا زاکانی جو تہران پارلیمنٹ میں ڈپٹی تھے نے "داسا" (ایران کی خبر رساں ایجنسی) کو بتلایا کہ صنعاء اب چوتھا عرب دارالخلافہ ہے جو ایرانی انقلاب میں شامل ہونے والا ہے۔ اس سے قبل بغداد، دمشق اور بیروت ایرانی انقلاب میں شامل ہو چکے ہیں۔

اور پھر واقعی اگلے دن یعنی ۲۱ ستمبر ۲۰۱۴ء کو صنعاء پہ حوثیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۲۹ اپریل ۲۰۱۶ء کو "نیویارک ٹائمز" کی اشاعت میں عبدربہ منصور ہادی یمن کے سابق صدر کا مضمون شائع ہوا

مضمون میں عبدربہ منصور ہادی نے ایران پر یمن کے بحران کو ہوا دینے کا الزام عائد کیا ہے۔ انہوں نے خبردار کیا کہ حوثی ملیشیا (Non-state actors) خطے میں ایران کے اشاروں پہ چلنے والی اگلی حزب اللہ بن سکتی ہے۔ عالمی تیل سپلائی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ ایران کی حکومت کو عام یمنیوں کی قسمت سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کو خطے میں اپنی بالادستی سے مطلب ہے۔

۷ جولائی ۲۰۲۲ء کو وکالہ انباء السعودیہ نے برٹش نیوی کے حوالے سے بتلایا کہ انہوں نے جنوب ایران کے بین الاقوامی پانیوں میں ایرانی میزائلوں کی کھیپ پکڑی گئی ہے، جو یمن کے حوثیوں کو بھجوائے جارہے تھے۔

۲ مارچ ۲۰۲۳ء کو اناادولو نیوز (ٹرکش نیوز) نے بتلایا کہ خلیج کے پانیوں میں ایرانی میزائلوں کی کھیپ پکڑی گئی ہے، جو یمن بھجوائے جارہے تھے۔

تنازع کی بنیادی جڑیں

حوثی-سعودی تنازع کی جڑیں ۲۰۱۵ء کے فوجی آپریشن سے کئی دہائیاں پہلے کے یمنی مسائل میں موجود ہیں:

۱۔ سیاسی عدم استحکام

یمن کئی برسوں سے کمزور سیاسی اداروں، اقتدار کی کشمکش اور قبائلی و علاقائی تقسیم کا شکار رہا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے بعد سیاسی انتقالِ اقتدار کے باوجود ایک ایسا نظام قائم نہیں ہو سکا جس سے تمام اہم گروہ مطمئن ہو سکتے۔

۲۔ شمال اور جنوب کی تقسیم

یمن تاریخی طور پر شمالی اور جنوبی سیاسی اکائیوں میں تقسیم رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں دونوں حصے متحد ہوئے، مگر اتحاد کے بعد بھی سیاسی اور معاشی اختلافات برقرار رہے۔ جنوبی یمن میں علیحدگی پسند تحریکیں بھی موجود رہیں، جس سے ملک کے اندرونی تنازع میں ایک اور فریق کا اضافہ ہوا۔

۳۔ معاشی مشکلات

غربت، بے روزگاری، کمزور بنیادی ڈھانچہ، خوراک اور ایندھن کی مشکلات نے عوامی بے چینی میں اضافہ کیا۔ ۲۰۱۴ء میں ایندھن کی قیمتوں میں اضافہ حوثیوں کی احتجاجی مہم کے فوری عوامل میں شامل تھا۔

۴۔ قبائلی اور علاقائی سیاست

یمن میں قبائلی تعلقات سیاسی طاقت کا ایک اہم حصہ رہے ہیں۔ مختلف قبائل اور مقامی گروہوں نے مختلف اوقات میں مختلف سیاسی قوتوں کا ساتھ دیا۔ اس وجہ سے تنازع محض دو فریقوں کے درمیان جنگ نہیں رہا بلکہ کئی مقامی اور علاقائی قوتیں اس میں شامل ہو گئیں۔

حوثیوں کا باطنی خبث

حوثی ملیشیا کا شعار، یا نعرہ یا منشور یہ ہے:

الله اكبر، الموت لأمريكا، الموت لإسرائيل، اللعنة على اليهود، النصر للإسلام

"اللہ اکبر۔ مرگ بر امریکہ۔ مرگ بر اسرائیل۔ یہود پہ لعنت۔ اسلام کی نصرت"۔

ایک طرف یہ ان کا نعرہ ہے مگر دوسری جانب یہ کہتے ہیں کہ امریکہ اسرائیل کے بحری جہازوں پہ حملہ نہیں کریں گے صرف سعودیہ کے بحری جہازوں پر حملے کریں گے۔

یہ معاملہ بالکل ایران کے پاسدارانِ انقلاب جیسا ہے جس پہ حملہ تو اسرائیل اور امریکہ نے کیا ہے مگر ان کے میزائل اسرائیل سے ۴/۵ گنا زیادہ عرب ممالک میں تباہی پھیلاتے ہیں۔

حملہ تو امریکہ اور اسرائیل نے کیا ہے مگر ہرمز سے عربوں کے بحری جہازوں کا گزرنا بھی بند کر دیا ہے۔ اصل ناکہ بندی تو عربوں کی ہوئی۔ امریکہ اور اسرائیل تو آبنائے ہرمز کو اتنا استعمال ہی نہیں کرتے۔ مثلاً قطر- بحرین اور کویت کی ۱۰۰ فیصد بحری تجارت یہیں سے ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا رستہ موجود ہی نہیں ہے۔

فلسطینی کاز کا اصل چیمپئن کون؟

اقوام متحدہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۴۷ء کے ایجنڈا میں مسئلہ فلسطین بھی شامل تھا۔ جس کے نتیجے میں بلاد شام یعنی ارض فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس موقع پہ فلسطین کے متعلق سعودی عرب کا پہلا باضابطہ کردار سامنے آیا۔ جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس ۲۸/اپریل تا ۱۵/مئی ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ فلسطین کی مخالفت کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اپنا موقف دیا کہ 'فلسطین عرب زمین ہے۔ وہاں یہودی ریاست قائم کرنا ظلم ہے جس کے نتیجے میں جنگ اور بدامنی ہو گی۔'

سعودی عرب کے فلسطینی کاز کی حمایت کے لیے اقدامات میں تسلسل ہے جو مالی، معاشی، سیاسی اور عسکری وغیرہ تمام جوانب کو محیط ہے۔ چونکہ یہ ہمارا اصل موضوع نہیں ہے لہذا یہاں صرف ایک حوالہ ہی دیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے جنوری ۲۰۲۶ کے محدث میں شائع شدہ ڈاکٹر آصف جاوید کے آرٹیکل "مسئلہ فلسطین پر

سعودی عرب کا ہمہ جہتی کردار" کا مطالعہ کیا جائے۔

حوثیوں کی جارحیت کی موجودہ لہر کے پیچھے اسرائیل ہے

بہت سارے عسکری ماہرین کے تجزیے سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں :

آیئے سب سے پہلے قرآن سے پوچھتے ہیں۔

﴿ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ﴾ [المائدۃ:۶۴]

" جب بھی یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت زمین میں فساد کرنے میں لگے رہتے ہیں"۔

آیت کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا یہ فسادی گروہ جنگ بھڑکانے کا کام اکثر کرتے ہیں۔ حالیہ برس ستمبر میں حوثیوں نے جس برق رفتاری سے باب المندب اور ملحقہ جزائر پہ قبضہ کر کے آبی گزر گاہ کا کنٹرول حاصل کیا اس سے اشارہ ملتا ہے کہ انہیں کہیں سے سپورٹ مہیا ہوئی ہے۔

عام طور پہ کسی بھی ملیشیا (Non State actors) کی یہ صفت ہوتی ہے کہ کوئی بھی انہیں مالی امداد کے نام پہ بطور پراکسی استعمال کر لیتا ہے۔ مالی امداد انہیں درکار ہوتی ہے کیونکہ ان کے ذاتی وسائل معدوم ہوتے ہیں۔

اس ستمبر کے جارحانہ اقدامات کے دوران ایک خاص بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حوثیوں نے سینکڑوں نئی ٹویوٹا ہائی لکس گاڑیاں استعمال کی ہیں۔ آگے کے کیبن میں حوثی بیٹھے ہوتے ہیں اور پیچھے مشین گن یا دوسرا اسلحہ لوڈ کیا ہوتا ہے۔ فور ویل گاڑی انہیں کچے پکے اور پہاڑی راستوں میں سہولت دیتی ہے ایک طرف تو نئی ٹویوٹا ہائی لکس ہیں، جبکہ دوسری جانب ان کی عام حالت اتنی خستہ ہے کہ فوجی وردی تو دور کی بات ہے ڈھنگ کے بوٹ بھی میسر نہیں ہیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ کسی گروہ نے انہیں یہ گاڑیاں مہیا کی ہیں اور جنہوں نے انہیں گاڑیاں مہیا کی ہیں وہ انہیں اپنی پراکسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ منظر صرف یمن میں ہی نہیں نظر آتا بلکہ اس سے پہلے عراق، شام، سوڈان، لیبیا میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعودی عرب کو ابراہیم اکارڈ قبول نہ کرنے کی سزا دی جا رہی ہے۔

سعودی عرب کے مداخلت کرنے کی وجوہات

مارچ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب نے دیگر اتحادی ممالک کے ساتھ مل کر یمن میں فوجی کارروائی شروع کی۔ سعودی نقطہ نظر سے اس مداخلت کے کئی بنیادی مقاصد تھے:

۱۔ قومی سلامتی

یمن سعودی عرب کا جنوبی ہمسایہ ہے اور دونوں ممالک کی ۱۴۵۰ کلو میٹر طویل سرحد ہے۔ حوثیوں کے یمن کے بڑے حصے پر کنٹرول کے بعد سعودی عرب کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس کی جنوبی سرحد پر ایک ایسا مسلح گروہ مضبوط ہو سکتا ہے جو مستقبل میں سعودی علاقے کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۲۔ میزائل اور ڈرون حملوں کا خطرہ

جنگ کے دوران حوثیوں نے سعودی عرب پر میزائل اور ڈرون حملے کیے۔ ان حملوں نے سعودی عرب کے لیے سرحدی اور داخلی سلامتی کے خدشات میں اضافہ کیا۔ اس صورتحال نے تنازع کو صرف یمن کی داخلی جنگ تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ سعودی سرزمین کی سلامتی کا مسئلہ بھی بنا دیا۔

۳۔ ایران کا علاقائی کردار

سعودی عرب اور ایران کئی برسوں سے مشرقِ وسطیٰ میں مختلف سیاسی اور سلامتی کے معاملات پر ایک دوسرے کے مقابل رہے ہیں۔ حوثیوں کے ساتھ ایران کے تعلقات اور مبینہ عسکری معاونت نے سعودی خدشات میں اضافہ کیا۔ تاہم ماہرین کے مطابق حوثی تحریک کو صرف ایران کی کٹھ پتلی قرار دینا یمن کے اندرونی سیاسی اور تاریخی عوامل کو نظر انداز کرنا ہوگا؛ حوثیوں کی اپنی مقامی سیاسی اور عسکری بنیاد بھی موجود ہے۔

۴۔ یمن کی حکومت کی حمایت

سعودی قیادت میں قائم فوجی اتحاد نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اس کی فوجی مداخلت کا مقصد یمن کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حکومت کو بحال کرنا اور حوثیوں کو مزید پیش قدمی سے روکنا ہے۔ دوسری جانب حوثیوں اور ان کے حامیوں نے سعودی مداخلت کو یمن کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت قرار دیا۔

سعودیہ اور ایران کو ایک ہی پلڑے میں ڈالنا ظلم ہے

اکثر تجزیہ نگار یہ کہتے ہوئے پائے جارہے ہیں کہ "اگر ایران یمن میں مداخلت کر رہا ہے تو سعودیہ بھی تو کر رہا ہے۔" یہ تقابل انتہائی معصومانہ انداز میں کیا جاتا ہے، لیکن یہ تو حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے والی بات ہے۔ ایک طرف ایران کا یمن کے ساتھ کوئی بارڈر نہیں لگتا، یمن کے معاملات کا ایران سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، جبکہ یمن کے بگڑتے حالات سے سعودی عرب براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سعودی

عرب وہاں کی منتخب اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حکومت کا تعاون کرتا ہے جس کا نتیجہ وہاں کی معیشت کی بحالی اور امن وامان کا قیام ہے، جبکہ ایران وہاں پر حکومت مخالف گروہوں کو جنگی سامان مہیا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہاں پر بغاوت ابھرتی اور امن وامان خراب ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایران وہاں شورش برپا کر رہا ہے اور سعودیہ وہاں پر قیام امن کے لیے کوشاں ہے، دونوں کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں!!!

یمن میں امن صرف یمنی عوام کے لیے نہیں بلکہ سعودی عرب، خلیجی خطے، بحیرہ احمر اور پوری عالمی تجارت کے لیے بھی اہم ہے۔ بحیرہ احمر اور باب المندب کی سلامتی کا معاملہ اب یمن کی جنگ کو ایک وسیع تر علاقائی اور عالمی مسئلہ بھی بنا چکا ہے۔

حوثیوں کا سدباب کیسے؟

حوثیوں کے خطرے سے نمٹنے کے لیے صرف جنگی صلاحیت اور قوت کافی نہیں، صرف بارود سے انہیں شکست دینا ممکن نہیں جیسا کہ دیگر دہشت گرد گروہوں کو صرف جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لیے سیاسی، سفارتی، معاشی اور سماجی اقدامات کی ضرورت ہوگی۔ یہ دہشت گرد جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط بیانیے کے ذریعے اپنے لیے مزید افراد بھرتی کرتے ہیں لہٰذا ان کے بیانیے کو ناکام کرنے کے لیے میڈیا کمپین ضروری ہے۔ جس میں علماء کرام اپنا کردار ادا کریں اور دلائل سے ان کے بیانیے کو ردّ کریں۔

گذشتہ صفحات میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایران نے اس جتھے کو میزائل اور ڈرون مہیا کیے ہیں۔ ایران سے اگر سعودی عرب کے تعلقات بہتر ہوں تو یہ سمگلنگ رک سکتی ہے۔ یہ ریسرچ ہونی چاہیے کہ حوثیوں کو ٹیوٹا ہائی لیکس گاڑیاں کس ذریعے سے ملی ہیں۔ اس نیٹ ورک کو بے نقاب اور ناکام کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی تحقیق ہونی چاہیے کہ انہیں مالی تعاون کون مہیا کر رہا ہے۔ اس پر کریک ڈاؤن ہونا چاہیے۔

خوشیوں کا مؤثر سدباب کرنے کے لیے ایک جامع سیاسی حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ یمن کے تمام فریقوں کو مذاکرات کی میز پے لایا جائے۔ اقوام متحدہ اور علاقائی ممالک کو اس ضمن میں کردار ادا کرنا چاہیے۔ ایسا معاہدہ کیا جائے جس میں ملک کی خود مختاری، قومی وحدت اور عوام کے حقوق کی ضمانت ہو۔

اس نکتہ پے پہنچنے کے لیے یمن کی معاشی بحالی ضروری ہے۔ غربت، بے روزگاری اور بد امنی نے عوام کو شدید مشکلات سے دوچار کیا ہوا ہے۔ اگر یمن میں تعلیم، روزگار اور بنیادی سہولیات کی فراہمی بہتر بنائی جائے تو مسلح گروہوں کے اثر ورسوخ میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ (انجینئر حافظ عتیق الرحمن کیلانی۔ الریاض)

اداریہ

تحفظِ حرمین شریفین سیمینار

آج کی دنیا ایک گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کر چکی ہے اور ہر ریاست دیگر ممالک کے ساتھ متعدد جہتوں میں تعلقات رکھتی ہے۔ بعض تعلقات ہمسائیگی کی بنیاد پر اور بعض نظریات کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ پاکستان کے بہت سے ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں، جن میں چین اور سعودی عرب سرفہرست ہیں۔ چین پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے اور طویل عرصے سے مختلف امور کے حوالے سے دونوں ممالک کا باہمی تعاون اور اشتراک جاری ہے۔ سعودی عرب اگرچہ ہمارا ہمسایہ ملک نہیں، لیکن دینی تعلق کی وجہ سے اس کے ساتھ پاکستان کی خصوصی قربت پائی جاتی ہے۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان میں کوئی بھی سیاسی حکومت رہی ہو، پاکستان اور سعودی عرب کے باہمی تعلقات خوشگوار رہے ہیں اور ان میں کسی قسم کا انقطاع نہیں آیا۔ پاکستان کے سعودی عرب کے ساتھ گہرے تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کے بہت سے لوگ روزگار کی تلاش میں سعودی عرب میں آباد ہیں، اور مختلف اداروں اور صنعتوں میں اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ بہت سے پاکستانی ڈاکٹرز اور انجینئرز سعودی عرب کے اہم سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہاں پر مقیم لاکھوں پاکستانی، جب اپنے ملک میں زرمبادلہ بھیجتے ہیں تو اس سے پاکستان کی معیشت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں سعودی عرب کی مختلف یونیورسٹیز میں بڑی تعداد میں پاکستانی طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہاں سے ہر سال سینکڑوں طلبہ اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹتے ہیں اور مختلف پرائیویٹ اور سرکاری تعلیمی جامعات میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بہت سے پاکستانی سعودی عرب کے تعلیمی اداروں میں بھی درس وتدریس کی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی معاملات کو بہتر بنانے کے لیے بھی سعودی عرب اپنی بساط کے مطابق کردار ادا کرتا آیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان سیاسی ڈیڈلاک پیدا ہوا اور پورا ملک سیاسی اعتبار سے عدمِ استحکام کا شکار ہو گیا تو اس وقت پاکستان میں متعین سعودی سفیر نے اس ڈیڈلاک کے خاتمے اور سیاسی

معاملات کو بہتر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پاکستان جب بھی کسی قدرتی آفت کی لپیٹ میں آیا، سعودی عرب نے برادر اسلامی ملک ہونے کے ناتے ہمیشہ پاکستان کی بھرپور مدد کی۔ شمالی علاقوں اور بالاکوٹ میں آنے والے ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے دوران سعودی عرب نے پاکستان کو بحالی کے لیے خطیر رقم بطور امداد دی۔ اس سے قبل جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے اور بین الاقوامی برادری کی جانب سے پاکستان پر شدید سفارتی اور معاشی دباؤ تھا تو پاکستان کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے سعودی عرب نے بھرپور کردار ادا کیا۔

شاہ فیصل مرحوم، دنیائے اسلام کو درپیش سیاسی مسائل کے حل میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے خصوصی طور پر کوشاں رہتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر انہوں نے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شاہ فیصل مرحوم کی شہادت جہاں سعودی عرب کے لیے ایک المناک خبر تھی، وہیں اہل پاکستان نے بھی اس پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا۔

پاکستان اور سعودی عرب کے باہمی تعلقات میں اُس وقت ایک نیا رنگ پیدا ہوا جب ۷ اگست ۲۰۲۶ء کو پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ نے "مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے" پر دستخط کیے۔

اس تاریخی معاہدے کے تینوں فریق دنیائے اسلام میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ پاکستان اللہ کے فضل سے جوہری طاقت رکھنے والا واحد اسلامی ملک ہے اور گزشتہ سال آپریشن "بنیانٌ مرصوص" اور "معرکہ حق" کے دوران پاکستان کی عسکری و دفاعی صلاحیت پوری دنیا پر واضح ہو چکی ہے۔ اسی طرح سعودیہ بھی عالمِ اسلام کا نمایاں ترین ملک ہے، جس کے ساتھ حرمین شریفین کی وجہ سے عالمِ اسلام کی غیر معمولی وابستگی ہے۔

ترکیہ بھی عالمِ اسلام کا ایک نمایاں ملک ہے اور کئی یورپی اقوام کے مقابلے میں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ترکیہ پاکستان کے دیرینہ دوستوں میں شامل ہے۔ پاک ترک تعلقات کی ایک طویل تاریخ ہے۔

مذکورہ تینوں ممالک کا دفاع کے لیے یکسو ہو جانا یقیناً عالمِ اسلام کے لیے مسرت اور خوشی کی خبر تھی۔ اس دفاعی معاہدے کی وجہ سے جہاں عالمِ اسلام کو تقویت حاصل ہوئی، وہیں مسلم امت کے مخالفین میں بھی بے چینی پیدا ہوئی۔ اس معاہدے کی وجہ سے بھارت اور اسرائیل میں غیر معمولی تشویش پائی جاتی ہے اور دونوں ممالک کے درمیان اس معاہدے کے بعد اعلیٰ سطحی روابط بھی دیکھنے کو ملے ہیں۔ البتہ اس معاہدے کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کے وقار میں اضافہ ہوا اور اب یہ توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں کہ پاکستان اپنی سیاسی اور عسکری ساکھ کی وجہ سے نہ صرف امتِ مسلمہ کے دفاع میں کردار ادا کرے گا، بلکہ امت کے دیگر مسائل

کے حل کے لیے بھی مؤثر کردار ادا کرے گا۔ ان شاء اللہ!

اس معاہدے میں ابتدائی طور پر تین ممالک شامل ہوئے ہیں، لیکن توقع کی جارہی ہے کہ آنے والے ایام میں مزید ممالک بھی اس معاہدے میں شامل ہوں گے، جس سے امتِ مسلمہ دفاعی اعتبار سے بڑے اور مؤثر بلاک کی شکل اختیار کر سکتی ہے اور پاکستان کو بھی عالمی سطح پر نمایاں کردار ادا کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

سعودی عرب اور پاکستان کے درمیان وفود کا تبادلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پاکستان کے سیاسی اور عسکری ذمہ داران اور مذہبی وسیاسی جماعتوں کے سربراہان وذمہ داران سعودی عرب کے سرکاری دوروں پر جاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سعودی عرب سے بھی نمایاں شخصیات پاکستان تشریف لاتی رہتی ہیں۔ پاکستان میں جب کبھی سعودی عرب سے کسی معزز مہمان کی آمد ہوتی ہے تو پاکستان کے دینی حلقوں کی طرف سے انہیں گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

ماضی میں بہت سے ائمہ حرمین پاکستان تشریف لا چکے ہیں، جن میں شیخ عبدالرحمن السدیس، شیخ صالح الحمید، شیخ صلاح البدیر اور دیگر نمایاں شخصیات شامل ہیں۔ کچھ عرصہ قبل، جب شئونِ حرمین کے مدیر شیخ صالح الحمید پاکستان تشریف لائے تو مجھے بھی ان سے ملاقات کرنے کا موقع ملا اور بہت سے علمی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔

ہر سال ستمبر کے آخری عشرے میں سعودی عرب اپنے قومی دن کے حوالے سے دنیا کے مختلف مقامات پر اہم تقریبات کا انعقاد کرتا ہے۔ پاکستان میں بھی اس حوالے سے ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے، جس میں دینی وسیاسی جماعتوں کے قائدین بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جہاں پاک سعودی تعلقات کے حوالے سے مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا جاتا ہے، وہیں ملک کے مختلف طبقات کو مل بیٹھنے کا موقع بھی ملتا ہے اور یہ تقریب ایک کل جماعتی کانفرنس کا نقشہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔

پاک سعودی تعلقات دینی اور نظریاتی بنیادوں پر استوار ہیں اور ان کی پختگی میں مسلمانوں کی حرمین شریفین سے وابستگی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے حرمین شریفین کے امن وتحفظ کے حوالے سے، دیگر مسلم ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ہمیشہ سے مثبت اور مخلصانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔

کچھ عرصے سے سعودی عرب کو دفاعی حوالے سے مختلف چیلنجز کا سامنا ہے۔ ان چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جہاں سعودی عرب اپنا کردار ادا کر رہا ہے، وہیں مسلم ممالک کو بھی اس حوالے سے معاونت کرنی چاہیے تاکہ سرزمینِ حرمین شریفین کے امن کو یقینی بنایا جاسکے۔ دنیا کے ہر ملک سے جانے والے حاجی اور

عمرہ زائرین اگر کسی بھی قسم کی بدامنی یا دہشت گردی کا شکار ہوں گے تو اس کے نتائج نہ صرف سعودی عرب کے امن پر مرتب ہوں گے بلکہ عالمِ اسلام پر بھی منفی اثرات پڑیں گے۔

پاک سعودی تعلقات مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اب جس مقام پر پہنچ چکے ہیں، اس کا بھی تقاضا ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اپنا کردار ادا کریں تاکہ دوستی اور اخوت کے اس رشتے کو آنے والے وقت میں مزید مضبوط بنایا جاسکے۔

بعض عناصر اس موقع پر پاکستان کی ریاستی اور خارجہ پالیسی کو بلاوجہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور سعودی عرب پر جارحیت کرنے والے گروہ کے ساتھ برابر کی سطح پر تعلقات استوار کرنے کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ گروہ یمن کی سیاسی اور تسلیم شدہ حکومت کے خلاف کارروائیوں میں مصروف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے خلاف بھی شدید جارحیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کیا مسلح بغاوت کرنے والے کسی گروہ اور سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے؟ کوئی بھی عقلمند اور باشعور انسان اس رویے اور طرزِ عمل کی حمایت نہیں کرسکتا۔

اسی پس منظر میں یکم اکتوبر ۲۰۲۶ء کو صبح دس بجے، قرآن وسنہ موومنٹ پاکستان کے زیرِ اہتمام جامعہ لاہور الاسلامیہ، مرکز بیت العتیق، لاہور میں عظیم الشان "تحفظِ حرمین شریفین سیمینار" منعقد ہوا۔ سیمینار کی میزبانی وائس چیئرمین قرآن وسنہ موومنٹ پاکستان اور قائم مقام رئیس جامعہ لاہور الاسلامیہ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ نے کی، جبکہ اس پروگرام کی سرپرستی ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی حفظہ اللہ اور ان کے برادرِ اصغر مولانا حافظ عبدالوحید روپڑی حفظہ اللہ نے فرمائی۔ سیمینار کی صدارت کی ذمہ داری راقم الحروف نے انجام دی، جبکہ نقابت کے فرائض ڈاکٹر شفیق الرحمن زاہد اور ڈاکٹر صلاح الدین نے ادا کیے۔ سیمینار میں مختلف دینی جماعتوں کے قائدین، علمائے کرام، مدارس کے مدیران اور عوام کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

صدارتی خطاب کے دوران، راقم نے سامعین کے سامنے اپنی گزارشات پیش کرتے ہوئے کہا کہ

"پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات کئی عشروں پر محیط ہیں اور دونوں ممالک کے تعلقات ہر دور میں مثالی رہے ہیں۔ دنیا بھر، بالخصوص پاکستان سے، مسلمان بڑی تعداد میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے سعودی عرب کا رخ کرتے ہیں۔ اگر اس مقدس خطے میں بدامنی پھیلائی گئی تو اس سے نہ صرف سعودی عرب بلکہ پوری امتِ مسلمہ میں تشویش پیدا ہوگی۔

بلادِ حرمین شریفین کے امن واستحکام کو یقینی بنانا حکومتِ پاکستان کی ذمہ داری ہے، جبکہ ترکیہ اور دیگر

ممالک کو بھی اس سلسلے میں سعودی عرب کے ساتھ تعاون اور اس کی حمایت کرنی چاہیے۔ سعودی عرب میں کسی بھی قسم کی بدامنی ناقابلِ قبول ہے۔

حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے قرآن وسنہ موومنٹ پاکستان، ملک کی دیگر دینی جماعتوں اور اداروں کے ساتھ مل کر اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان دفاعی معاہدہ موجود ہے، تاہم اگر یہ معاہدہ نہ بھی ہوتا تو بھی حرمین شریفین کا تحفظ ہر مسلمان کی شرعی ذمہ داری ہے"۔

امیر جماعت اہلِ حدیث حافظ عبد الغفار روپڑی حفظہ اللہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"حرمین شریفین کے تحفظ پر کسی بھی صورت سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ مکہ معاہدہ کے تحفظ، حکومتِ پاکستان اور پاک فوج کی حمایت کیلئے عوامی سپورٹ، میڈیا اور بیداری کانفرنسوں کی ضرورت ہے"۔

صدر جمعیت اہلِ حدیث علامہ ہشام الٰہی ظہیر حفظہ اللہ نے کہا کہ

"اگر سعودی عرب کو ضرورت پیش آئی تو پاکستان کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے میدانِ عمل میں ہوگی"۔

مرکزی مسلم لیگ کے رہنما مولانا امیر حمزہ حفظہ اللہ نے کہا کہ

"حرمین شریفین کا تحفظ صرف سعودی عرب کا نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کا مسئلہ ہے۔ جنگی حالات میں حرمین کی پاسبانی ہمارا فرض ہے"۔

مرکزی جماعت اہلِ حدیث کے سربراہ حافظ زبیر احمد ظہیر حفظہ اللہ نے کہا کہ

"محض باتوں سے نہیں، عملی میدان میں یکجہتی دکھانی ہوگی۔ ہم ماضی میں بھی حرمین شریفین کے تحفظ کے لیے یکسو رہے ہیں اور آئندہ بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں"۔

مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے مرکزی رہنما پروفیسر یاسین ظفر حفظہ اللہ نے کہا کہ

"دینی ادارے بھی حرمین شریفین کے تحفظ کے سلسلے میں کسی صورت پیچھے نہیں رہیں گے"۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ کے سابق شیخ الحدیث مولانا رمضان سلفی حفظہ اللہ نے فرمایا کہ

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال قبل مکہ مکرمہ میں توحید کا پہلا مرکز تعمیر کیا۔ اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود آج وہاں لاکھوں زائرین کی آمد اللہ کے وعدے کی سچائی ہے۔ انہوں نے حرمین کے تحفظ کے لیے پاکستان، ترکیہ اور سعودی عرب کے اتحاد کو مثبت پہلو قرار دیا اور اس بات پر

زور دیا کہ تمام مسلمانوں اور اہل علم کو حرمین شریفین کی ناموس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہنما مولانا غضنفر عزیز حفظہ اللہ نے کہا کہ

"حرمین شریفین کا تحفظ کسی حکومت یا گروہ سے وابستگی نہیں، بلکہ اسلامی عقیدے کا تقاضا اور تمام اختلافات سے بالاتر ہو کر امتِ مسلمہ کے اتحاد کا بنیادی محور ہے"۔

نائب صدر و مشیر امور خارجہ، جمعیت اہل حدیث پاکستان ڈاکٹر حافظ ابو بکر حفظہ اللہ (اسلام آباد) نے سعودی عرب کو پیغام دیتے ہوئے کہا کہ

نحن خلفاؤكم في باكستان، نحن من كنا معكم في كل خطوة، ونحن كنا معكم في كل العهود من التاريخ، تاريخنا يشهد على ذلك، عندما كانت تهب الرياح ضد المملكة، كنا واقفين شامخين بقوة ومحبة، وعلى أساس ديني وثقة تامة.

"ہم پاکستان میں آپ کے جانشین ہیں، ہم وہ لوگ ہیں جو ہر قدم پر آپ کے ساتھ رہے ہیں، اور تاریخ کے ہر دور میں ہم آپ کے ساتھ کھڑے رہے ہیں۔ ہماری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی مملکت کے مخالف ہوائیں چلیں، ہم پوری قوت، محبت، دینی بنیادوں اور کامل اعتماد کے ساتھ ثابت قدمی سے ڈٹ کر کھڑے رہے۔"

قرآن وسنہ موومنٹ کے راہنما ڈاکٹر علامہ منیر احمد وقار حفظہ اللہ نے واضح کیا کہ

"حرمین کی عظمت کا ذکر خود خالقِ کائنات نے قرآن میں فرمایا ہے۔ انہوں نے سورۃ الفیل أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ کے تناظر میں بتایا کہ جس نے بھی اللہ کے گھر پر حملے کی جسارت کی، اسے ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔"

سیمینار سے شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم، شیخ الحدیث محمد شفیق مدنی، شیخ الحدیث مولانا عبد الرشید تونسوی، ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی، ڈاکٹر شفیق الرحمن زاہد، قاری سید محمد علی ہاشمی، ڈاکٹر مطیع اللہ باجوہ، مولانا عتیق الرحمن علوی اور دیگر رہنماؤں نے بھی خطاب کیا اور حرمین شریفین کے ساتھ بھرپور یکجہتی کا اظہار کیا۔

تحفظِ حرمین شریفین کے حوالے سے مقررین کی تقاریر پر شرکاء نے بھرپور جوش وجذبے کا اظہار کیا اور سعودی عرب کو یہ پیغام دیا کہ ہم سب ان کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور کھڑے رہیں گے ان شاء اللہ۔ یوں یہ سیمینار اپنے جلو میں بہت سی خوبصورت یادیں لیے اپنے اختتام کو پہنچا۔ (حافظ ابتسام الٰہی ظہیر)

غلو اور انتہا پسندی کے بعض مظاہر

حافظ خضر حیات

دینی معاملات میں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا، نہ صرف فرد کو اعتدال کی راہ سے ہٹادیتا ہے بلکہ مجموعی طور پر معاشرتی ہم آہنگی کے لیے بھی خطرہ بن جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا امتیازی وصف میانہ روی ہے۔ قرآن کریم نے شریعتِ محمدی کے پیروکاروں کو "امتِ وسط" قرار دیا اور نبی اکرم ﷺ نے دین میں غلو سے صراحتاً منع فرمایا ہے۔ اس لیے غلو کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کے مظاہر کا ذکر ایک اہم علمی ضرورت ہے، تاکہ امت اپنے مبنی بر اعتدال کردار کو برقرار رکھ سکے۔

اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے غلو کی لغوی و اصطلاحی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

غلو کی لغوی و اصطلاحی تعریف

غلو کے مختلف معانی ہیں، جن میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ کسی بھی چیز میں حد سے بڑھ جانا اور حدود کو کراس کرنا۔ جیسا کہ ابن فارس رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

الغين واللام والحرف المعتل، أصل صحيح يدل على ارتفاع ومجاوزة قدر[1].

"مادہ (غ ل و) اصلاً بلندی اور حد سے تجاوز کرنے پر دلالت کرتا ہے۔"

دیگر علمائے لغت نے بھی اسی مفہوم کو واضح کیا ہے۔

الغُلُوُّ: تَجَاوُزُ الحَدِّ، يُقَالُ ذَلِكَ فِي السِّعْرِ، وَفِي القَدْرِ، وَفِي الاعْتِقَادِ وَالمَنَازِلِ.

"غلو حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے، یہ قیمت، مقدار اور عقائد و مراتب سب میں حد سے بڑھنے کے لیے بولا جاتا ہے[2]۔"

---

1 مقاييس اللغة، مادة 'غلو / غلى''

2 المفردات في غريب القرآن للراغب الأصفهاني، ص: ٦١١

وَالْغُلُوُّ: الْمُبَالَغَةُ فِي الشَّيْءِ وَالتَّشْدِيدُ فِيهِ بِتَجَاوُزِ الْحَدِّ [1].

"غلو کسی بھی چیز میں مبالغہ کرنا اور حد سے تجاوز کر کے اس میں سختی برتنا ہے۔"

اصطلاحی طور پر دین میں غلو سے مراد دینی تعلیمات کی ایسی سمجھ بوجھ یا عمل ہے، جو اس کے اصل مفہوم سے ہٹ کر حد سے تجاوز کر جائے۔

فیومیؒ فرماتے ہیں:

غلا في الدين غلوا من باب قعد: تصلب وتشدد حتى جاوز الحد، وفي التنزيل: ﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ [النساء: ١٧١]

"غلا فی الدين غلوا" "باب قَعَدَ" سے ہے۔ یعنی اس قدر سختی اور شدت اختیار کرنا کہ معاملہ حد سے گزر جائے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

"اپنے دین میں غلو نہ کرو۔"

یعنی غلو عقائد و اعمال میں اس شدت کا نام ہے جو شریعت کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جائے۔ شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان کا پاس و لحاظ ہی اعتدال ہے اور ان سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دین میں غلو سے منع فرمایا ہے۔ سورۃ النساء میں اہلِ کتاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔"

سورۃ المائدۃ (آیت ۷۷) میں بھی اسی مفہوم کی تاکید موجود ہے۔ ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے بتایا کہ غلو عقیدے کی غلط فہمیوں، خواہشاتِ نفس کی پیروی اور دین کی سمجھ میں کمی کے باعث پیدا ہوتا ہے اور اس کا قرآنی علاج اعتدال یعنی وسطیت ہے۔

حدیث نبوی ﷺ میں بھی ارشاد ہوا:

إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّينِ [2].

---

١ فتح الباري شرح صحيح البخاري لابن حجر، ١٣/ ٢٧٨

٢ مسند أحمد:٣٢٤٨ ، مستدرک الحاکم:١٧٢٩ ، الصحيحة: ١٢٨٣

”دین میں غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگ بھی دین میں غلو کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے تھے۔“
عربی زبان میں تشدد، تنطع، تطرف وغیرہ الفاظ بھی غلو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔
نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:
هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ، قَالَهَا ثَلَاثاً.
”متنطع (غلو، بال کی کھال نکالنے اور بے جا شدت برتنے) والے ہلاک ہوگئے۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ متواتر فرمائی[1]۔“
اہلِ علم نے اس حدیث کی تشریح میں کہا ہے کہ غلو کا مطلب دین میں سختی اختیار کرنا اور حد سے بڑھ جانا ہے۔ اور اس حد سے مراد وہ حدود ہیں جو شریعت نے مقرر کی ہیں۔

غلو کے دو رخ: افراط اور تفریط

غلو بعض دفعہ 'افراط' کی صورت میں ہوتا ہے اور بعض دفعہ 'تفریط' کی صورت میں۔ عام تصور یہ ہے کہ غلو صرف 'شدت' کا نام ہے، حالانکہ دین سے بے توجہی اور تساہل بھی شریعت کی حدود سے نکل جانے ہی کی ایک صورت ہے۔

جو چیز مقررہ حد سے بڑھ جائے وہ 'زیادتی' ہے اور جو اس سے کم رہ جائے وہ 'کوتاہی' ہے اور اعتدال ان دونوں کے درمیان کی بہترین راہ ہے، جبکہ یہ دونوں انتہائیں ہی مذموم ہیں۔ اسی لیے عصرِ حاضر میں دو متضاد رویے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف شدت پسند، متشدد اور حرفیت پسند گروہ ہے۔ اور دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو دین کے بنیادی اصولوں سے ہی غافل ہے۔ دونوں ہی قرآن وسنت کے متوازن پیغام سے ہٹے ہوئے ہیں۔
اسی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے مطرف بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
الحسنة بين السيئتين.
”نیکی دو برائیوں کے درمیان ہوتی ہے۔[2]“
یہاں دو برائیوں سے مراد ایک افراط اور دوسری تفریط ہے۔

---

1 صحیح مسلم: ۲۶۷۰؛ قال النووي في شرحه (١٦/ ٢٢٠): «أي: المتعمقون الغالون المجاوزون الحدود في أقوالهم وأفعالهم»

2 المحجة في سير الدلجة لابن رجب، ص: ١٨

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: السنة بين الغالي والجافي[1].

"سنت غلو کرنے والے اور جفا کرنے والے کے درمیان (کا راستہ) ہے۔"

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی خوبصورت بات بیان فرمائی ہے:

وَمَا أَمَرَ اللهُ بِأَمْرٍ إِلَّا وَلِلشَّيْطَانِ فِيهِ نَزْغَتَانِ: إِمَّا تَقْصِيرٌ وَتَفْرِيطٌ، وَإِمَّا إِفْرَاطٌ وَغُلُوٌّ؛ فَلَا يُبَالِي بِمَا ظَفِرَ مِنَ الْعَبْدِ مِنْ هَاتَيْنِ الْخَطِيئَتَيْنِ[2].

"اللہ عزوجل نے کسی بھی بات کا حکم نہیں دیا مگر اس میں شیطان کے دو وسوسے (اور راستے) ہوتے ہیں: یا تو کوتاہی و تفریط کی طرف لے جانا، یا پھر زیادتی اور غلو کی طرف لے جانا۔ (اور) شیطان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ ان دونوں گناہوں میں سے کس کے ذریعے بندے پر قابو پالے۔"

غلو اور مبالغہ میں فرق

'مبالغہ' کا تعلق عموماً اظہار سے ہوتا ہے۔ یعنی کلام یا بیان میں کسی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ یہ لغوی و ادبی سطح پر ایک فنی صفت اور ادبی صنف ہے جو کہ بذاتِ خود ہمیشہ مذموم نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس غلو کا تعلق دین کے معاملے میں اعتقاد اور عمل کی حدوں کو پامال کرنے سے ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مبالغہ جب تک حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہے قابلِ تحمل ہے، لیکن جب یہی مبالغہ دینی معاملات میں حد سے تجاوز بن جائے تو وہ 'غلو' ہے۔ گویا غلو ہر صورت میں مذموم ہے۔ جبکہ مبالغہ اس وقت تک مذموم نہیں، جب تک حقیقت کے دائرے میں رہے۔ ہاں حقیقت سے تجاوز کرنے کی صورت میں وہ بھی غلو کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔

غلو درحقیقت تساہل ہے اور تساہل درحقیقت غلو ہے

اس بات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کہ جو شخص ایک سمت میں حد سے بڑھ جاتا ہے وہ عملاً دوسری سمت کی ذمہ داریوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ جو شخص دوسروں کو متشدد یا اہلِ بدعت قرار دینے میں غلو کرتا ہے، وہ درحقیقت فرائض و سنن سے لاپرواہی کا شکار ہوتا ہے۔ 'اعتدال' وہ راہ ہے جو نہ انتہا پسندی کی طرف مائل ہو اور نہ کوتاہی و غفلت کی طرف۔ کیونکہ یہ دونوں رویے صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے اور دین کے منصفانہ و متوازن پیغام کے منافی ہیں۔

---

١ سنن الدارمي: ٢٢٣ وكشف الكربة لابن رجب، ص: ٣٢٣

٢ الوابل الصيب: ص: ١٤ ومدارج السالكين: ٢/ ٣٧٥

شخصیت میں توازن، اعتدال اور حلم کا تقاضا ہے کہ دوسروں کو تشدد و بے صبری کا طعنہ بھی نہ دیا جائے، اسی طرح ایسی گفتگو بھی نہ کی جائے، جس پر غیر متوازن لوگوں کے جذبات بھڑکتے ہوں، اور دینی اعتبار سے اس کا کوئی فائدہ بھی نہ ہو۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ حقیقی علم والے دوسروں کو جہالت کے طعنے نہیں دیتے، خاندانی حسب و نسب اور مال والے دوسروں کو ملنگ فقیر اور کمی کمین کہہ کر نہیں پکارتے!

یہ وہ تشدد ہے جس میں عموماً انسان اعتدال و توازن کے نام پر مبتلا ہو جاتا ہے اور غلط فہمی میں رہتا ہے کہ بس دوسرے ہی راہِ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔

یہاں یہ سمجھنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ کسی فرد یا گروہ پر "متساہل" یا "متشدد" کا حکم لگانا بظاہر دوسرے کی کیفیت بیان کرنا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ خود متکلم کی پوزیشن واضح کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص ناحق یہ کہہ دے کہ فلاں متساہل ہے یا فلاں متشدد ہے، تو وہ دراصل بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ خود غلط جگہ کھڑا ہے اور چیزوں کو غلط انداز سے پرکھ رہا ہے۔ اس لیے کسی پر حکم لگانے سے پہلے حقیقت کی مکمل چھان بین اور احتیاط ضروری ہے، کیونکہ یہی رویہ غلو کی جڑ ہے۔

عصرِ حاضر میں غلو کے بعض مظاہر

غلو کسی ایک شکل تک محدود نہیں؛ یہ عقیدے، عمل، جذبے اور تعلق کے ہر شعبے میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ کبھی تکفیر کی صورت اختیار کرتا ہے، کبھی تبدیع و تجریح کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی اتحاد اور رواداری کے نام پر دین کی حدود مٹاتا ہے، کبھی فرقہ واریت کی مذمت کے بہانے نیا فرقہ بن جاتا ہے، کبھی نصوص کی اتباع کے دھوکے میں ظاہریت پرستی کی طرف لے جاتا ہے، کبھی منہجِ سلف کے بیان میں شدت کا روپ دھار لیتا ہے، کبھی حق کی تائید، باطل کی تردید اور دفاعِ صحابہ و اہل بیت کے نام پر حد سے بڑھ جاتا ہے، کبھی حکمرانوں کی اطاعت کے مسئلے میں شدت پیدا کرتا ہے اور کبھی تنظیم سازی کے معاملے میں تعصب کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ذیل میں عصر حاضر کے تناظر میں ان میں سے چند اہم مظاہر کا جائزہ لیا جا رہا ہے:

ا۔ تکفیر میں غلو

تکفیر یعنی "کسی مسلمان کو کافر قرار دینا" غلو کی خطرناک ترین صورتوں میں سے ایک ہے، کیونکہ اہلِ سنت کا منہج تکفیر سے باز رہنے اور مسلمان کے بارے میں حسنِ ظن قائم رکھنے کا ہے۔ بعض شدت پسند گروہ گناہ گار مسلمانوں، شریعت کی روشنی میں فیصلے نہ کرنے والے حکمرانوں، ان حکمرانوں کے ماتحت رہنے والوں اور یہاں

تک کہ اسلامی تنظیموں سے نکلنے والوں کو بھی کافر قرار دے دیتے ہیں۔ انتہا پسندوں کا یہ سلسلہ حکمرانوں کی تکفیر سے شروع ہو کر معاشرتی اداروں اور پوری معاشرتی اکائیوں تک پھیل چکا ہے، جس سے امت کی وحدت کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ تکفیر ایسا نازک معاملہ ہے جس کے اثرات الزام لگانے والے اور جس پر الزام لگایا گیا، دونوں پر پڑتے ہیں۔ اور آج بہت سے مسلمان بغیر تحقیق کے اس سنگین الزام کا نشانہ بن رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِأَخِيهِ: يَا كَافِرُ، فَقَدْ بَاءَ بِهِ أَحَدُهُمَا [1].

”جب کوئی شخص اپنے بھائی کو کہے: 'اے کافر!' تو ان دونوں میں سے ایک اس (کفر) کے ساتھ لوٹتا ہے۔“

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يُكَفِّرَ أَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَإِنْ أَخْطَأَ وَغَلِطَ حَتَّى تُقَامَ عَلَيْهِ الْحُجَّةُ، وَتُبَيَّنَ لَهُ الْمَحَجَّةُ، وَمَنْ ثَبَتَ إِسْلَامُهُ بِيَقِينٍ لَمْ يَزُلْ ذَلِكَ عَنْهُ بِالشَّكِّ، بَلْ لَا يَزُولُ إِلَّا بَعْدَ إِقَامَةِ الْحُجَّةِ وَإِزَالَةِ الشُّبْهَةِ.

”کسی بھی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کافر قرار دے، اگرچہ اس نے غلطی یا خطا ہی کیوں نہ کی ہو، جب تک کہ اس پر حجت قائم نہ کر دی جائے اور واضح راستہ کھول کر بیان نہ کر دیا جائے۔ اور جس کا اسلام یقین کے ساتھ ثابت ہو چکا ہو وہ محض شک وشبہ کی بنا پر زائل نہیں ہوتا، بلکہ صرف قطعی حجت قائم ہونے اور شبہ دور ہو جانے کے بعد ہی زائل ہوتا ہے۔“ [2]

غلو کی اس صورت میں مبتلا ہونے والے متشددین بدترین تضاد کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف تشدد وتنطع میں مبتلا ہو کر مسلمانوں پر تکفیر کے فتوے لگاتے ہیں، جبکہ دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفر اور اس کی ایجنسیوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔

۲۔ تبدیع وتجریح میں غلو

تبدیع یعنی ”کسی کو بدعتی قرار دینا“ اور تجریح یعنی ”کسی پر تنقید وجرح کرنا“، یہ دونوں اہلِ علم کے نزدیک مخصوص اصولوں، شرائط اور ضوابط کے پابند امور ہیں۔ عصرِ حاضر میں غلو کی ایک صورت یہ ہے کہ بلا تحقیق

---

۱ صحیح بخاری: ۶۱۰۴، صحیح مسلم: ۲۱۶

۲ مجموع الفتاوی لابن تیمیة: ۱۲/ ٤٦٦

افراد کو بدعتی اور مجروح قرار دے دیا جاتا ہے اور معمولی اختلافِ فہم کو بدعت وضلالت سے جوڑ دیا جاتا ہے، 'تاویلِ سائغ' یا 'خلافِ معتبر' کو نظر انداز کرتے ہوئے مخالفین کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تکفیر، تبدیع اور تجریح کی یہی بے ضابطہ سرگرمیاں دین کی متوازن تعلیمات کے منافی ہیں۔

اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہر وقت رد و قدح میں مبتلا رہتی ہے، بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر وہ شخص جس سے اللہ رب العالمین کوئی دینی خدمت لیتا ہے، یہ اس کے درپے ہو جاتے ہیں، اس کی بے شمار خوبیوں کو چھوڑ کر اس کی چند خامیاں اچھالنا ان کے نزدیک دین و منہج کی خدمت قرار پاتا ہے۔

حالانکہ معتبر اہل علم کا اس حوالے سے رویہ مختلف تھا، ذیل میں اس حوالے سے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَلَوْ أَنَّ كُلَّ مَنْ أَخْطَأَ فِي اجْتِهَادِهِ - مَعَ صِحَّةِ إِيمَانِهِ، وَتَوَخِّيهِ لِاتِّبَاعِ الْحَقِّ - أَهْدَرْنَاهُ، وَبَدَّعْنَاهُ، لَقَلَّ مَنْ يَسْلَمُ مِنَ الْأَئِمَّةِ مَعَنَا! رَحِمَ اللهُ الْجَمِيعَ بِمَنِّهِ وَكَرَمِهِ[1].

”اگر ہم ہر اس شخص کو، جس سے اجتہاد میں کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو — بایں ہمہ کہ اس کا ایمان درست ہو اور وہ حق کی پیروی کا متلاشی ہو — ساقط الاعتبار قرار دینے لگیں اور اسے بدعتی کہہ دیں، تو ہمارے ائمہ میں سے شاید ہی کوئی محفوظ بچے! اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سب پر رحم فرمائے۔“

امام محمد بن نصر المروزیؒ (متوفی ۲۹۴ھ) کے تذکرے میں جب حافظ ابن مندہؒ نے ان کے بعض اقوال پر سخت گرفت کی، تو امام ذہبیؒ نے یہ تاریخی جملہ لکھا:

وَلَوْ أَنَّا كُلَّمَا أَخْطَأَ إِمَامٌ فِي اجْتِهَادِهِ فِي آحَادِ الْمَسَائِلِ خَطَأً مَغْفُوراً لَهُ؛ قُمْنَا عَلَيْهِ، وَبَدَّعْنَاهُ، وَهَجَرْنَاهُ، لَمَا سَلِمَ مَعَنَا لَا ابْنُ نَصْرٍ، وَلَا ابْنُ مَنْدَه، وَلَا مَنْ هُوَ أَكْبَرُ مِنْهُمَا! وَاللهُ هُوَ هَادِي الْخَلْقِ إِلَى الْحَقِّ، وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، فَنَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْهَوَى وَالْفَظَاظَةِ[2].

---

١ سير أعلام النبلاء للذهبي: ١٤/ ٣٧٦

٢ سير أعلام النبلاء للذهبي: ١٤/ ٤٠، ترجمة: الإمام محمد بن نصر المروزي

"اگر ہم ہر اس موقع پر کہ جب کسی امام سے فروعی وجزوی مسائل میں اجتہادی غلطی سرزد ہو جائے جو (ان کے اخلاص کی وجہ سے) معاف شدہ ہے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور انہیں بدعتی قرار دینے لگیں اور ان کا بائیکاٹ (ہجر) کرنے لگیں؛ تو ہمارے پاس نہ ابن نصر محفوظ بچیں گے، نہ ابن مندہ، اور نہ ان دونوں سے بڑے ائمہ! اور اللہ تعالیٰ ہی مخلوق کو حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے، پس ہم افتادِ طبع اور سنگ دلی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

امام قتادہ بن دعامہ السدوسیؒ (متوفی ۱۱۷ھ) کے تذکرے میں جب ان کی طرف تقدیر کے مسئلے میں ایک تاویل کی نسبت کا ذکر آیا، تو امام ذہبیؒ کا رویہ ملاحظہ کریں، فرماتے ہیں:

وَكَانَ يَرَى القَدَرَ - نَسْأَلُ اللهَ العَفْوَ -، وَمَعَ هَذَا، فَمَا تَوَقَّفَ أَحَدٌ فِي صِدْقِهِ، وَعَدَالَتِهِ، وَحِفْظِهِ، وَلَعَلَّ اللهَ يَعْذُرُ أَمْثَالَهُ مِمَّنْ تَلَبَّسَ بِبِدْعَةٍ يُرِيدُ بِهَا تَعْظِيمَ البَارِي وَتَنْزِيهَهُ، وَبَذَلَ وُسْعَهُ، وَاللهُ حَكَمٌ عَدْلٌ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ...

"اور وہ تقدیر کے معاملے میں تاویل کے قائل تھے —ہم اللہ سے عفو و درگزر مانگتے ہیں— لیکن اس کے باوجود کسی ایک نے بھی ان کی سچائی، عدالت اور حفظِ حدیث میں مقام و مرتبے کے اعتراف میں توقف نہیں کیا۔ شاید اللہ تعالیٰ ان جیسے لوگوں کو معذور سمجھے جو اللہ رب العالمین کی تعظیم اور تنزیہ بیان کرنے کی غرض سے کسی بدعت و انحراف میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے اس میں اپنی پوری وسعت صرف کر دی؛ اور اللہ تو عادل اور بندوں پر مہربان ہے..."

اسی طرح فرماتے ہیں:

ثُمَّ إِنَّ الكَبِيرَ مِنْ أَئِمَّةِ العِلْمِ إِذَا كَثُرَ صَوَابُهُ، وَعُلِمَ تَحَرِّيهِ لِلْحَقِّ، وَاتَّسَعَ عِلْمُهُ، وَظَهَرَ ذَكَاؤُهُ، وَعُرِفَ صَلاَحُهُ وَوَرَعُهُ وَاتِّبَاعُهُ، يُغْفَرُ لَهُ زَلَلُهُ، وَلاَ نُضَلِّلُهُ وَنَطْرَحُهُ وَنَنْسَى مَحَاسِنَهُ؛ نَعَمْ، وَلاَ نَقْتَدِي بِهِ فِي بِدْعَتِهِ وَخَطَئِهِ، وَنَرْجُو لَهُ التَّوْبَةَ مِنْ ذَلِكَ[1].

"پھر ائمہ علم میں سے وہ بلند پایہ ہستی جس کی درست باتیں بکثرت ہوں، حق کی تلاش اس کا شیوہ ہو، اس کا علم وسیع ہو، اس کی ذہانت نمایاں ہو، اور اس کا تقویٰ، پرہیزگاری اور اتباعِ سنت معروف ہو؛ تو

1 سير أعلام النبلاء للذهبي: ٥/ ٢٧١، ترجمة: قتادة بن دعامة

اس کی لغزش معاف کر دی جاتی ہے، ہم نہ تو اسے گمراہ قرار دے کر پھینک سکتے ہیں اور نہ اس کے محاسن وخوبیوں کو فراموش کر سکتے ہیں۔ ہاں! ہم اس کی بدعت یا غلطی میں اس کی پیروی نہیں کریں گے، لیکن اس کے لیے اس غلطی سے توبہ ومغفرت کی امید رکھیں گے۔"

مشہور محدث ابوذر الہرویؒ کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

وَالحَاذِقُ إِذَا خَاضَ فِي شَيْءٍ فَرُبَّمَا زَلَّتْ قَدَمُهُ، وَمَنْ ذَا الَّذِي مَا سَاءَ قَطُّ؟![1]

"اور بڑا ذہین اور ماہر عالم بھی جب کسی باریک مسئلے میں غوطہ زن ہوتا ہے تو بسا اوقات اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے؛ اور بھلا وہ کون ہے جس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہی نہ ہوئی ہو؟!"

علامہ ابن حزم الاندلسیؒ کے تذکرے میں ان کے شذوذ اور بعض کلامی وفقہی تفردات پر گرفت کے ساتھ ان کے علم اور اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَلِي أَنَا مَيْلٌ إِلَى أَبِي مُحَمَّدٍ؛ لِمَحَبَّتِهِ فِي الحَدِيثِ الصَّحِيحِ، وَمَعْرِفَتِهِ بِهِ، وَإِنْ كُنْتُ لَا أُوَافِقُهُ فِي كَثِيرٍ مِمَّا يَقُولُهُ فِي الرِّجَالِ وَالعِلَلِ، وَالمَسَائِلِ البَشِعَةِ فِي الأُصُولِ وَالفُرُوعِ، وَأَقْطَعُ بِخَطَئِهِ فِي غَيْرِ مَا مَسْأَلَةٍ، وَلَكِنْ لَا أُكَفِّرُهُ، وَلَا أُضَلِّلُهُ، وَأَرْجُو لَهُ العَفْوَ وَالمُسَامَحَةَ وَلِلْمُسْلِمِينَ، وَأَخْضَعُ لِفَرْطِ ذَكَائِهِ وَسَعَةِ عُلُومِهِ[2].

"اور میرا ابو محمد (ابن حزم) کی طرف میلان ہے، کیونکہ انہیں حدیثِ صحیح سے دلی محبت تھی اور اس کی معرفت تھی؛ اگرچہ میں ان کی بہت سی باتوں سے متفق نہیں ہوں جو انہوں نے راویوں کے احوال، عللِ حدیث اور اصول و فروع کے بعض عجیب وغریب مسائل میں کہی ہیں، بلکہ مجھے ان کے متعدد مسائل میں غلطی پر ہونے کا قطعی یقین ہے؛ لیکن اس کے باوجود میں نہ تو ان کی تکفیر کرتا ہوں اور نہ انہیں گمراہ قرار دیتا ہوں، بلکہ ان کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے اللہ سے عفو و درگزر کی امید رکھتا ہوں اور ان کی بے پناہ ذہانت اور علوم کی وسعت کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

اسی طرح امام ابو حامد الغزالیؒ کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

---

١ سير أعلام النبلاء للذهبي:١٦/ ٢٨٥، ترجمة: أبو ذر الهروي

٢ سير أعلام النبلاء للذهبي:١٨/ ٢٠٢-٢٠١، ترجمة: ابن حزم

الغَزَّالِيُّ إِمَامٌ كَبِيرٌ، وَمَا مِنْ شَرْطِ العَالِمِ أَنَّهُ لَا يُخْطِئُ... وَمَا زَالَ الأَئِمَّةُ يُخَالِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً، وَيَرُدُّ هَذَا عَلَى هَذَا، وَلَسْنَا مِمَّنْ يَذُمُّ العَالِمَ بِالهَوَى وَالجَهْلِ[1].

”غزالی ایک عظیم امام ہیں، اور عالم ہونے کی یہ شرط نہیں ہے کہ اس سے کبھی کوئی غلطی ہی نہ ہو!... ہمیشہ سے ائمہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے آئے ہیں اور ایک دوسرے پر نقد و رد کرتے رہے ہیں، لیکن ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی عالم کی مذمت نفسانی خواہش یا جہالت کی بنیاد پر کرتے ہیں!“

حافظ ابنِ عساکر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ زبان زدِ عام ہے:

لُحُومُ الْعُلَمَاءِ مَسْمُومَةٌ، وَعَادَةُ اللهِ فِي هَتْكِ أَسْتَارِ مُنْتَقِصِيهِمْ مَعْلُومَةٌ[2].

”علماء کا گوشت زہریلا ہے، اور ان کی تنقیص کرنے والوں کے پردے چاک کرنے کے بارے میں اللہ کا ضابطہ (سب پر) عیاں ہے۔“

گو اس کو بھی ہر کوئی اپنے من پسندیدہ علماء کے بارے میں ہی ذکر کرتا ہے، لیکن عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ تمام اہل علم کا درجہ بہ درجہ احترام و ادب بجالایا جائے، ان کی غلطیوں پر تنبیہ کی جائے، لیکن ان کی شخصیت پر بازاری جملے بازی اور زبانِ طعن دراز نہ کی جائے!

۳۔ اتحاد و اتفاق اور رواداری کے نام پر غلو

اتحاد، اتفاق اور رواداری عظیم اسلامی اقدار ہیں۔ قرآن کریم میں ان کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے اور سنت نبویہ میں ان پر تربیت کی گئی ہے۔ لیکن یہاں بھی غلو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب حق اور باطل کے درمیان حدیں مٹادی جائیں، اصولوں پر سمجھوتہ کر لیا جائے، اور دین کے بنیادی احکام نظر انداز کر دیے جائیں۔ جس طرح شدت پسندی دین سے انحراف ہے، اسی طرح دین کے اصولوں کو خاطر میں نہ لانے والا رویہ بھی غلو کی ایک صورت ہے۔ اعتدال کا تقاضا ہے کہ رواداری کو اصولوں کے لیے قربان نہ کیا جائے اور حق و باطل میں تمیز باقی رہے۔

---

۱ سير أعلام النبلاء للذهبي: ۱۹/ ۳۳۹- ۳۴۳، ترجمة: الغزالي

۲ تبيين كذب المفتري لابن عساكر، ص: ۲۹

اتحاد و اتفاق میں غلو کی عصرِ حاضر میں بدترین صورت یہ ہے کہ بعض لوگ تقاربِ ادیان اور وحدتِ ادیان کا نعرہ بلند کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے مکسچر کو 'دین ابراہیمی' کے نام پر پیش کرنا اتحاد و اتفاق کا تقاضا ہے، جو کہ غلو اور گمراہی کی بدترین قسم ہے۔ اس قسم کے اتحاد کی اسلام میں کوئی گنجائش ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ ضرور اس پر عمل پیرا ہوتے!

اسی طرح اتحاد و اتفاق کے نام پر سنت کا استخفاف کرنا بھی غلو ہی کی ایک شکل ہے۔ مثلاً یہ مشورہ دینا کہ عبادات کے طریقوں میں سنت اور بدعت، صحیح اور غلط کے فرق کو مٹا دیا جائے، تاکہ امت میں اتحاد ہو جائے؛ حالانکہ یہ باطل اتحاد کسی صورت ممکن نہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝٨٥﴾

[آل عمران: ٨٥]

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔"

فرمانِ رسول ﷺ ہے:

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ، ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ، إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ.

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت کا جو شخص بھی میرے بارے میں سنے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، پھر وہ اس دعوت پر ایمان لائے بغیر مر جائے جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے، تو وہ جہنمیوں میں سے ہو گا۔"[1]

درست رویہ یہی ہے کہ مشترکات پر اتحاد کیا جائے اور جو چیز قرآن و سنت سے ثابت شدہ ہے، کسی بھی حال میں اس پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

حق و باطل میں فرق مٹا کر، سنت و بدعت کو ایک بنا کر، گمراہ و ہادی کو ایک لائن میں کھڑا کر کے اتحاد نہیں

---

۱ صحیح مسلم: ۱۵۳

ہو گا، بلکہ تعامل اور رویوں میں توازن و اعتدال کی ضرورت ہے، گویا مقصد اختلاف ختم کرنا نہیں بلکہ آدابِ اختلاف سیکھنے، سکھانے کی ضرورت ہے۔

۴۔ فرقہ واریت کی مذمت میں غلو

اتحاد و اتفاق کے نام پر غلو میں مبتلا لوگوں میں ایک اور غلو پایا جاتا ہے کہ یہ فرقہ واریت کی مذمت میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق کی دعوت اور فرقہ واریت کی مذمت یقیناً مطلوب و مقصود ہے، لیکن بعض افراد اس مذمت میں ایسا غلو کرتے ہیں کہ وہ خود نئی فرقہ واریت کا سبب بن جاتے ہیں۔ فرقہ واریت ختم کرنے کے بہانے کسی خاص گروہ یا مکتبِ فکر کو بدنام کرنے میں شدت اختیار کرلی جاتی ہے، جو اسی بیماری کا دوسرا روپ ہے جس کی تردید کی جارہی ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں مرزا جہلمی اور جماعت اسلامی وغیرہ کے جذباتی لوگ اس کی واضح مثال ہیں، جو روایتی مکاتبِ فکر اور ان سے منسلک اہلِ علم کو دین کے خلاف سازش سمجھتے ہیں، لیکن خود اس قدر تعصب و جمود میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اپنے قائد، لیڈر اور دھڑے کے موقف سے ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں ہوتے!

۵۔ اتباعِ نصوص اور حرفیت پسندی کا غلو

نصوص کی اتباع واجب ہے، لیکن بعض لوگ ظاہریت و سطحیت کا شکار ہو کر غلو کرتے ہوئے مقاصدِ شریعت، نصوص کے سیاق وسباق اور فہمِ سلف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ حرفیت پسندی انتہا پسندی کی ایک معروف شکل ہے، جسے محققین نے دین کے متوازن پیغام سے ہٹے ہوئے رویے کے طور پر بیان کیا ہے۔ حقیقی اتباع یہ ہے کہ نصوص کو اصولوں اور مقاصد کے ساتھ سمجھا جائے، نہ کہ چند الفاظ اور حروف کی آڑ میں شریعت کے اصل معانی و مفاہیم سے روگردانی کی جائے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

إِنَّ الْعَالِمَ حَقِيقَةً هُوَ الَّذِي يَأْخُذُ الشَّرِيعَةَ كُلِّيَّةً وَاحِدَةً، وَيَفْهَمُ أَلْفَاظَهَا بِمَقَاصِدِهَا... فَإِنَّ الْوُقُوفَ مَعَ ظَوَاهِرِ الْأَلْفَاظِ دُونَ فَهْمِ مَعَانِيهَا وَسِيَاقِهَا هُوَ مَسْلَكُ أَهْلِ الْبِدَعِ وَالْخَوَارِجِ الَّذِينَ عَمُوا عَنْ مَقَاصِدِ الشَّرِيعَةِ.[1]

---

1 الموافقات للشاطبي: ٣/ ٩، والاعتصام: ٢/ ٧٢٠

”حقیقی عالم وہ ہے جو پوری شریعت کو ایک کلیہ کے طور پر لے، اور اس کے الفاظ کو مقاصد کے تناظر میں سمجھے... الفاظ کے محض ظاہر پر جمود اختیار کرنا اور ان کے سیاق و مقاصد سے غافل ہو جانا در حقیقت اہل بدعت اور خوارج کا طریقہ ہے جو مقاصدِ شریعت سے اندھے ہو گئے تھے۔“

اس ڈگر پر گامزن لوگ اپنی واضح اور کھلی غلطی کو بھی قرآن و سنت کا نام دے کر اس پر مُصِر نظر آتے ہیں، جبکہ دوسری طرف ائمہ اسلام اور اساطینِ علم کو جہالت اور گمراہی کا طعنہ دے رہے ہوتے ہیں۔

٦۔ منہجِ سلف کے نام پر غالیانہ رویے

سلف صالحین کے منہج کی وضاحت اور اس پر عمل اہم ذمہ داری ہے، لیکن اس میں بھی غلو اس وقت پیدا ہو جاتا ہے، جب سلف کا منہج کسی خاص گروہ کی شناخت اور اجارہ داری بنالیا جائے اور اس کو مروّجہ فرقوں میں سے ایک فرقہ بنالیا جائے، اور دوسروں کو ان کے اخلاص اور عمل کے باوجود اس دائرے سے خارج کر دیا جائے۔ منہجِ سلف کے بیان میں غلو دوسروں پر حکم لگانے میں جلدی، بے بنیاد الزامات اور اپنی پوزیشن کو ہی واحد حق قرار دینے کی شکل اختیار کر سکتا ہے، جبکہ سلف کا حقیقی منہج میانہ روی، حکمت اور عدل کا تھا۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

السَّلَفِيَّةُ: هِيَ اتِّبَاعُ مَنْهَجِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَصْحَابِهِ؛ لِأَنَّهُمْ هُمُ الَّذِينَ سَلَفُونَا وَتَقَدَّمُوا عَلَيْنَا، فَاتِّبَاعُهُمْ هُوَ السَّلَفِيَّةُ. وَأَمَّا اتِّخَاذُ السَّلَفِيَّةِ كَمَنْهَجٍ خَاصٍّ يَنْفَرِدُ بِهِ الْإِنْسَانُ وَيُضَلِّلُ مَنْ خَالَفَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَلَوْ كَانُوا عَلَى حَقٍّ، وَاتِّخَاذُ السَّلَفِيَّةِ كَمَنْهَجٍ حِزْبِيٍّ؛ فَلَا شَكَّ أَنَّ هَذَا خِلَافُ السَّلَفِيَّةِ...ألخ

”سلفیت حقیقت میں منہجِ نبوی اور منہجِ صحابہ کی اتباع کا نام ہے؛ کیونکہ وہی ہمارے سلف ہیں اور ہم سے آگے ہیں، چنانچہ ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہی ”سلفیت“ کہلاتا ہے۔ جبکہ ”سلفیت“ کو کوئی انسان اپنا خاص منہج بنا کر اس منہج کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں کو گمراہ قرار دے، چاہے وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، اور سلفیت کو گروہ بندی و فرقہ واریت کا ذریعہ بنائے، تو بلاشبہ یہ عمل سلفیت کے خلاف ہے... کیونکہ سلف صالحین سب کے سب سنتِ رسول ﷺ پر اتفاق و اتحاد کیساتھ قائم رہنے کی دعوت دیتے آئے ہیں، وہ کسی شخص کو بنا بر تاویل مخالفانہ رائے رکھنے کی وجہ سے گمراہ نہیں کہتے تھے، ہاں البتہ عقائد کے بارے میں سلف صالحین مخالف رائے رکھنے والے کو گمراہ کہتے آئے ہیں، جبکہ فقہی

اور عملی مسائل میں سلف صالحین نرمی برتتے تھے۔ لیکن ہمارے اس دور میں سلفیت اپنانے والے کچھ لوگ اپنے ہر مخالف کو گمراہ قرار دیتے ہیں، چاہے مخالف حق بات بھی کرے، جبکہ کچھ لوگوں نے سلفیت کو دھڑے بندی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے، جیسے اسلام کی طرف منسوب دیگر فرقوں اور جماعتوں کا طریقہ کار ہے۔ یہ بات کسی صورت بھی قابلِ قبول نہیں ہے، انہیں کہا جائے گا کہ سلف صالحین کے موقف اور تعامل کو دیکھیں، وہ کیا عمل کرتے تھے؟ ان کی ایسے مسائل میں وسعتِ ظرفی دیکھیں، جہاں اجتہاد کی گنجائش نکلتی ہے۔ سلف صالحین کا بڑے بڑے عقدی اور فقہی مسائل میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ اہلِ علم اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے، جبکہ کچھ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالی کو دیکھا ہے۔ اسی طرح کچھ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا، اور کچھ کہتے ہیں کہ اعمال نامے کا وزن کیا جائے گا۔ اسی طرح آپ سلف صالحین کا فقہی مسائل میں بھی بہت زیادہ اختلاف پائیں گے، نکاح، وراثت، خرید و فروخت سمیت دیگر مسائل میں ان کی مختلف آراء ملیں گی، اس سب کے باوجود ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو گمراہ نہیں کہتا تھا۔ چنانچہ سلفیت کا یہ مفہوم ہر گز نہیں کہ یہ ایک مخصوص خدوخال والی جماعت ہے اور اپنے علاوہ ہر کسی کو گمراہ کہتی ہے؛ بلکہ ایسے لوگوں کا تو سلفیت سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے[1]۔"

۷۔ حق کی تائید اور باطل کی تردید کے نام پر غلو

حق کی تائید اور باطل کی تردید ہر مسلمان کا فریضہ ہے، لیکن بعض اوقات اس فریضے کی ادائیگی میں بھی غلو آجاتا ہے۔ تائید میں مبالغہ اور تردید میں حد سے تجاوز، حتیٰ کہ ظلم اور جھوٹ تک کا ارتکاب کر لینا۔ جو شخص "حق" کے نام پر جھوٹ بولے، بہتان تراشے اور دوسروں کی عزت کو نشانہ بنائے، وہ حقیقت میں اسی بیماری کا شکار ہے جس کا وہ خود علاج کرنا چاہتا ہے۔

حق کی تائید میں غلو کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کو آپ حق پر سمجھتے ہیں اس کی غلطیوں کا بھی دفاع کیا جائے۔ مثلاً جو شخص توحید و سنت پر قائم ہے، وہ کافروں سے موالات کرے، فحش و منکرات کی سرپرستی کرے، تو یہ کہہ کر اس کی تائید کی جائے کہ یہ 'اہل توحید و سنت' ہیں، ان کو کچھ نہیں کہنا چاہیے، جبکہ جو باطل پر

---

۱ لقاءات الباب المفتوح ٣/ ٢٤٦

ہے، وہ اللہ کے راستے میں جہاد جیسی عظیم عبادت بھی کرے تو یہود و ہنود کی طرح ان پر تنقید کے تیر برسائے جائیں۔ تو یہ بھی غلو ہی ہے۔

جاہلیت میں یہ رویہ عام تھا کہ ہر صورت اپنے قبیلے کا دفاع اور دوسرے کی مخالفت کرنی ہے۔ صد افسوس کہ یہی صورت حال ہمارے ہاں بعض لوگوں میں رائج ہے، اور یہ سارا کچھ حق کی تائید اور باطل کی تردید جیسے خوشنما نعروں کے تحت کیا جاتا ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ [المائدة: ۸]

"اے ایمان والو! اللہ کے لیے انصاف پر قائم رہتے ہوئے گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل چھوڑ دو۔ عدل کرو، یہی تقویٰ کے قریب ترین رویہ ہے۔"

رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ عصبیت کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

أَنْ تُعِينَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ [1].

"عصبیت یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرو۔"

چنانچہ تمام مظاہر غلو کی طرح یہ صورت بھی قرآن و سنت کے متوازن منہج کے خلاف ہے۔

۸۔ حکمرانوں کی اطاعت کا مسئلہ اور غلو

حکمرانوں کی اطاعت کا مسئلہ سیاست شرعیہ کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ اس میں بھی غلو کے دو رخ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تکفیری شدت پسندی ہے جو حکمرانوں کو فوری طور پر کافر قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کا جواز نکال لیتی ہے، اور دوسری طرف اطاعت کے نام پر غلو ہے جو شرعی حدود کو نظر انداز کر کے سرکشی اور ظلم کی اطاعت کو بھی لازمی قرار دے دیتا ہے۔ اصل میں یہ دونوں راہیں شریعت کی متوازن تعلیمات سے ہٹی ہوئی ہیں۔ شریعت نے حکمرانوں سے حسنِ سلوک، خیر خواہی اور شرعی حدود کے معاملے میں سچ کہنے کا حکم دیا ہے، تکفیر کے غلو یا اطاعت کے غلو میں الجھنے سے منع کیا ہے۔

اس حوالے سے کچھ لوگ تو اس انتہا پر ہیں کہ حکمرانوں کی معروف اور جائز باتیں ماننے اور ان کے ساتھ تعاون کو بھی 'درباری ملائیت، کاسہ لیسی' قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری انتہا یہ ہے کہ منکرات کی بھرمار اور

۱　سنن أبي داود: ۵۱۱۹، سنن ابن ماجہ: ۳۹۴۹، وحسنہ الأرناؤوط

حدود اللہ کی حرمت پامال ہونے پر بھی 'اطاعت' کا درس دیا جاتا ہے۔

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ [1].

"ہر مسلمان پر (حکمرانوں کی بات) سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے، چاہے اسے وہ بات پسند ہو یا ناپسند، سوائے اس کے کہ اسے گناہ کا حکم دیا جائے۔ پس اگر اسے گناہ و معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا جائز ہے اور نہ اطاعت کرنا۔"

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ [2].

"خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت (جائز) نہیں ہے۔"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

سَيَكُونُ أُمَرَاءُ تَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ؛ فَمَنْ أَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ»، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، أَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لَا، مَا صَلَّوْا [3].

'عنقریب ایسے حکمران آئیں گے جن کے بعض کاموں کو تم شریعت کے مطابق پاؤ گے اور بعض کاموں کو شریعت کے خلاف پاؤ گے۔ پس جس نے (اپنی استطاعت کے مطابق زبان سے) انکار کیا وہ بری الذمہ ہو گیا، اور جس نے (دل سے) برا جانا وہ (گناہ سے) بچ گیا، لیکن ہلاکت اس کی ہے جو ان کے باطل پر راضی ہوا اور ان کی پیروی کی۔ 'صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا' : نہیں! جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں (تب تک ان کے خلاف قتال جائز نہیں)۔

ان احادیث کی روشنی میں اہل علم نے جہاں یہ بات واضح طور پر لکھی ہے کہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت و خروج کی راہ پر چلنا درست راستہ نہیں، اسی طرح یہ بھی صراحت کی ہے کہ محض حق کے بیان اور انکارِ منکر کو ہی خروج سمجھ لینا، یہ وہ غلو ہے، جس میں مرجئہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔

---

۱ صحیح بخاری: ۷۱۴۴، صحیح مسلم: ۱۸۳۹

۲ مسند أحمد: ١٠٩٥، وصححه الألباني في مشكاة المصابيح: ٣٦٩٦

۳ صحیح مسلم: ۱۸۵۴

ائمہ اسلام نے ان دونوں رویوں (خروج اور انکارِ منکر) کے فرق کو ہمیشہ واضح فرمایا ہے:

امام نووی (متوفی ٦٧٦ھ) فرماتے ہیں:

وَأَمَّا قَوْلُهُ ﷺ: (أَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لَا، مَا صَلَّوْا)؛ فَفِيهِ مَعْنَى مَا سَبَقَ أَنَّهُ لَا يَجُوزُ الْخُرُوجُ عَلَى الْخُلَفَاءِ بِمُجَرَّدِ الظُّلْمِ أَوِ الفِسْقِ مَا لَمْ يُغَيِّرُوا قَوَاعِدَ الإِسْلَامِ... وَأَمَّا الإِنْكَارُ عَلَيْهِمْ وَوَعْظُهُمْ فَلَا يُسْقِطُهُ شَيْءٌ، بَلْ هُوَ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ قَادِرٍ بِحَسَبِ اسْتِطَاعَتِهِ[1].

"اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان میں وہی مفہوم ہے جو پہلے گزرا کہ حکمرانوں کے محض ظلم یا فسق کی بنا پر ان کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں جب تک کہ وہ اسلام کے بنیادی قواعد کو نہ بدل دیں... لیکن ان کے غلط کاموں پر شرعی طریقے سے انکار کرنا اور انہیں نصیحت کرنا کسی بھی حالت میں ساقط نہیں ہوتا، بلکہ یہ ہر صاحبِ استطاعت شخص پر اس کی وسعت کے مطابق واجب ہے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ٧٢٨ھ) فرماتے ہیں:

وَأَهْلُ الاسْتِقَامَةِ فِي بَابِ الإِمَامَةِ وَالأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ: بَيْنَ الَّذِينَ يُوَافِقُونَ الْوُلَاةَ عَلَى الإِثْمِ وَالعُدْوَانِ وَيَرْكَنُونَ إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا، وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يَرَوْنَ أَنْ يُعَاوِنُوا أَحَدًا عَلَى البِرِّ وَالتَّقْوَى... فَالأَوَّلُونَ يَدْخُلُونَ فِي الْمُحَرَّمَاتِ، وَهَؤُلَاءِ يَتْرُكُونَ وَاجِبَاتِ الدِّينِ، وَأَهْلُ الاسْتِقَامَةِ وَالاعْتِدَالِ يُطِيعُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ بِحَسْبِ الإِمْكَانِ، فَيَتَّقُونَ اللهَ مَا اسْتَطَاعُوا، وَلَا يَتْرُكُونَ مَا أُمِرُوا بِهِ لِفِعْلِ غَيْرِهِمْ مَا نُهِيَ عَنْهُ[2].

"اور اہل سنت والجماعت حکمرانوں کے حقوق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب میں دو انتہاؤں کے درمیان معتدل ہیں: ایک طرف وہ لوگ ہیں جو حکمرانوں کے گناہ اور ظلم پر بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور ظالموں کی طرف جھک جاتے ہیں، اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتے۔ پس پہلے لوگ حرام امور کے مرتکب ہوتے ہیں اور

١ شرح صحيح مسلم للنووي: ١٢/ ٢٢٩

٢ جامع المسائل لابن تيمية: ٣/ ٩٠، المستدرك على مجموع الفتاوى: ١/ ١٦٣

دوسرے لوگ دین کے واجبات کو چھوڑ دیتے ہیں؛ جبکہ اہل استقامت و اعتدال (گناہ میں ساتھ دیے بغیر) اپنی استطاعت کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری کو محض اس لیے ترک نہیں کرتے کہ دوسروں نے ممنوع کام کا ارتکاب کیا ہے۔"

حافظ ابن رجب الحنبلیؒ (متوفی ۷۹۵ھ) فرماتے ہیں:

وَالإِنْكَارُ عَلَى الْمُلُوكِ وَالأُمَرَاءِ بِاللِّسَانِ وَالقَوْلِ الحَقِّ هُوَ أَفْضَلُ الجِهَادِ، وَلَيْسَ هُوَ مِنَ الخُرُوجِ المَنْهِيِّ عَنْهُ؛ فَإِنَّ الخُرُوجَ إِنَّمَا يَكُونُ بِالسَّيْفِ وَالسِّلَاحِ، وَمَا زَالَ الصَّحَابَةُ وَالسَّلَفُ يُنْكِرُونَ عَلَى الأُمَرَاءِ مَا يُخَالِفُ الشَّرِيعَةَ عَلَانِيَةً دُونَ أَنْ يَخْرُجُوا عَلَيْهِمْ[1].

"اور بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے زبان سے انکار کرنا اور کلمہ حق کہنا تو افضل ترین جہاد ہے، اور یہ ہرگز اس خروج میں شامل نہیں جس سے روکا گیا ہے؛ کیونکہ ممنوعہ خروج صرف تلوار اور ہتھیار کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ سے صحابہ کرام اور سلف صالحین حکمرانوں کے خلاف خروج کیے بغیر ان کے شریعت مخالف امور پر برسرِعام انکار کرتے رہے ہیں۔"

۹۔ تنظیم سازی کا مسئلہ اور غلو

۱۹۲۴ء میں سقوطِ خلافت عثمانیہ کے بعد تنظیم سازی ایک ضرورت اور مصلحت کے تحت اختیار کی گئی، لہٰذا دعوت و تبلیغ، دینی مصالح کے حصول اور مفاسد سے بچنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی خاطر تنظیمیں، انجمنیں، جماعتیں، جمعیتیں وجود میں آئیں، اس میں غلو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تنظیمی وابستگی کو ایمان کا معیار بنا کر دوسروں کے ساتھ تعصب اور مخالفت کا رویہ اختیار کیا جائے، جو کہ شریعت کی متوازن تعلیمات کے منافی ہے۔ تنظیم ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں؛ اسے مقصد بنالینا اور دین کا معیار قرار دینا غلو ہی ہے، جبکہ اس کے مدِ مقابل غلو یہ ہے کہ محض تنظیم سازی کو ہی بدعت اور منہج سے خروج قرار دے دیا جائے، جیسا کہ کئی ایک لوگوں نے کئی ایک علماء کو حزبی اور بدعتی کا ٹائٹل صرف اس وجہ سے دے دیا ہے کہ وہ اسلام کی سربلندی اور معاشرتی اصلاح کے لیے کسی نظم، تنظیم یا سرکل کا حصہ ہیں۔

---

۱ جامع العلوم والحكم لابن رجب: ۲/ ۲٤٤

۱۰۔ صحابہ و اہل بیت سے متعلق رویوں میں غلو

صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم سے متعلق رویوں میں اعتدال اسلامی عقیدے کا ایک بنیادی ستون ہے۔ خیر القرون سے ہی رافضیت اور ناصبیت دو متضاد اور گمراہ فکریں چلی آ رہی ہیں، جن کا اہل علم نے ہر دور میں درجہ بہ درجہ رد فرمایا۔ جب اہل بیت سے متعلق غلو پیدا ہوا، ان کے لیے عصمت اور الوہیت کے درجے تراشے گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق توہین و تحقیر، سبّ و شتم اور تکفیر کا بدترین رویہ اپنایا گیا تو وہاں سے رافضیت نے جنم لیا۔

لیکن اسی رویے کے رد میں کچھ لوگوں نے ردِ رافضیت کے نام پر غلو کے رویے اپنانا شروع کر دیے اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے، جو کسی بھی سنی کو رافضیت نواز، رافضی سہولت کار کہہ کر اس پر جو مرضی الزام لگا دیتا ہے۔ اور اس طرح کی گفتگو کی جاتی ہے کہ اصل گمراہی رافضیت ہے جو ہر جگہ موجود ہے، جبکہ ناصبیت نامی کوئی گمراہی موجود ہی نہیں ہے!

ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی بعض لوگ دو انتہاؤں میں مبتلا ہیں: ایک طرف وہ رافضی یا نام نہاد حسینی ہیں، جو ہر اس سنی کو جو صحابہ کرام سے محبت کرتا ہے، ناصبی اور یزیدی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف وہ گروہ ہے، جس کے نزدیک ناصبیت نامی کسی گمراہی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، لہٰذا اس کی تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ جو شخص بھی ناصبیت کے رد کی بات کرے یا اہل بیت اطہار کے صحیح فضائل بیان کرے، انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت کسی رافضی سازش کا شکار ہے!

امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ذات کے متعلق دونوں گمراہ انتہاؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

يَهْلِكُ فِيَّ رَجُلَانِ: مُحِبٌّ مُفْرِطٌ يُقَرِّظُنِي بِمَا لَيْسَ فِيَّ، وَمُبْغِضٌ يَحْمِلُهُ شَنَآنِي عَلَى أَنْ يَبْهَتَنِي [1]

"میرے معاملے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے: ایک حد سے بڑھ کر محبت کرنے والا (غالی رافضی) جو میری ایسی مدح کرے جو مجھ میں نہیں اور دوسرا بغض رکھنے والا (ناصبی) جس کی مجھ سے دشمنی اسے مجھ پر بہتان تراشی پر آمادہ کرے۔"

امام ابن تیمیہؒ نے 'العقیدہ الواسطیہ' میں اہل سنت کے اس زریں و متوازن منہج کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

---

[1] مسند أحمد: ١٣٧٧، والسنه لابن أبي عاصم: ٩٨٣، وحسنه الألباني

وَهُمْ وَسَطٌ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ بَيْنَ الرَّافِضَةِ وَالنَّوَاصِبِ [1].

"اور اہل سنت اصحاب رسولؐ کے معاملے میں رافضہ اور نواصب کے درمیان بالکل میانہ رو ہیں۔"

اور منهاج السنة النبوية میں رافضہ اور نواصب دونوں کے رد میں لکھتے ہیں:

وَالْحُبُّ لِعَلِيٍّ وَتَرْكُ قِتَالِهِ خَيْرٌ بِإِجْمَاعِ أَهْلِ السُّنَّةِ مِنْ بُغْضِهِ وَقِتَالِهِ. وَهُمْ مُتَّفِقُونَ عَلَى وُجُوبِ مُوَالَاتِهِ وَمَحَبَّتِهِ، وَهُمْ مِنْ أَشَدِّ النَّاسِ ذَبًّا عَنْهُ، وَرَدًّا عَلَى مَنْ يَطْعَنُ عَلَيْهِ مِنَ الْخَوَارِجِ وَغَيْرِهِمْ مِنَ النَّوَاصِبِ، لَكِنْ لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ. وَالرَّافِضَةُ لَا يُمْكِنُهُمْ أَنْ يُثْبِتُوا وُجُوبَ مُوَالَاتِهِ كَمَا يُمْكِنُ أَهْلُ السُّنَّةِ [2].

"اہل سنت کے اجماع کے ساتھ علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنا اور ان کے خلاف قتال سے رکنا، ان سے بغض رکھنے اور قتال کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ ان سے محبت اور موالات واجب ہے، اور اہل سنت خوارج اور دیگر نواصب کی طرف سے علی رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے والوں کے خلاف سب سے زیادہ دفاع کرنے والے اور ان کا رد کرنے والے ہیں۔ لیکن ہر مقام کے لیے ایک کلام ہوتا ہے۔ اور رافضہ ان (علی رضی اللہ عنہ) کی موالات کا وجوب اس طرح کبھی ثابت نہیں کر سکتے جس طرح اہل سنت نے ثابت کیا ہے۔"

اہل سنت کے ہاں ناصبیت کے رد کے نام پر رافضیت کی تائید غلط ہے تو رافضیت کے رد کے نام پر ناصبیت کی حمایت بھی درست نہیں۔ ایک انتہا پسندی کا رد کرتے ہوئے دوسری انتہا پسندی کو تحفظ دینا دوہرا معیار ہے۔

غلو کے تمام مظاہر کا مشترکہ عنصر یہ ہے کہ وہ شریعت کی مقررہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں، اس لیے محققین نے اعتدال (وسطیت) کو ہر قسم کے غلو کے خلاف علاج قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ میں امت اسلام کو "امتِ وسط" قرار دیا ہے؛ یعنی ایک منصفانہ اور متوازن امت جو لوگوں پر گواہ ہو۔ یہی وہ منہج ہے جو امت کو شدت پسندی اور غفلت دونوں طرح کے انتہا پسند رویوں سے دور رکھتا ہے۔ چنانچہ غلو کے خلاف پہلا قدم اس کی پہچان اور پھر دوسروں پر حکم لگانے میں احتیاط کرنا ہے، اور دوسرا قدم اعتدال کو شعار بنا کر فرد اور معاشرہ دونوں کو شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اپنا دینی و اخلاقی کردار ادا کرنے کی راہ دکھانا ہے۔

---

۱ العقيدة الواسطية مع مجموع الفتاوى: ٣/ ١٥٤

۲ منهاج السنة النبوية لابن تيمية: ٤/ ٣٩٥

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر ثانی

قسط اول

حضرت العلاّم مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ: افکار و نظریات

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

مدیر مجلہ محدث ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ کی تجویز تھی کہ برصغیر پاک وہند کے کبار علماء کی فکر کو مجلہ محدث کی زینت بنانا چاہیے تاکہ آج کے اہل حدیث نوجوان کی فکری رہنمائی ہوسکے۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک وہند کے اکابر اہل حدیث علماء کی سوانح اور افکار و نظریات پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے کہ جس میں بانی مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان جناب مولانا داود غزنوی اور محدث العصر مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمہما اللہ پر دو مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ اس بار حضرت العلام مولانا اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے دوسرے امیر بھی رہے ہیں۔ انہوں نے حدیث اور اہل حدیث کے دفاع میں بہت کچھ لکھا ہے، جو بلاشبہ ہزاروں صفحات پر محیط ہے۔ حال ہی میں مولانا سلفی کے متفرق و متنوع رسائل، مضامین اور کتب کو دس جلدوں میں نگارشات کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ راقم الحروف نے اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں مولانا سلفی کی تصنیفات اور تالیفات کا دو مرتبہ مطالعہ کیا، اس میں اہم مقامات کو ہائی لائیٹ کیا، اس کے بعد ان نشان زدہ اقتباسات کو نکالا، انہیں ابواب بندی کی صورت میں ایک منطقی ترتیب دی اور اس کے بعد اس سلسلۂ مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا کہ جس کی پہلی قسط پیشِ خدمت ہے۔

مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ سلسلۂ مضامین تقریباً چار اقساط میں مکمل ہو گا۔ اس کی پہلی قسط میں برصغیر پاک وہند میں اہل حدیث کی تاریخ و تحریک کے حوالے سے مولانا کے افکار و نظریات کو جمع کیا گیا ہے۔ دوسری قسط میں حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، تقلید اور تصوف کے مسئلہ میں مولانا کے افکار کو پیش کیا جائے گا۔ تیسری قسط جماعت اسلامی اور دیگر سیاسی تحریکوں کے بارے مولانا کے افکار پر مشتمل ہو گی۔ اور چوتھی قسط میں معاصر اہل حدیث علماء، اہل حدیث جماعتوں، اہل حدیث مدارس اور ان کی تنظیم و تحریک کے بارے میں مولانا کے افکار کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔ ان شاء اللہ

ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ کا مشورہ تھا کہ مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات کو پیش کرتے ہوئے اپنی بات کم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ انہی کی عبارتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا جائے۔ پس اس قسط میں راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارتوں کے بیان پر ہی اکتفا کیا جائے اور اپنے الفاظ میں وضاحتی نوٹس بھی نہ ہونے کے برابر رکھے جائیں۔ چار اقساط پر مشتمل اس سلسلۂ مضامین میں، مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے چار ہزار صفحات میں پھیلے افکار و نظریات کا، تقریباً ایک صد صفحات میں، انہی کے الفاظ میں منطقی ترتیب کے ساتھ ایک جامع خلاصہ پیش کیا جائے گا، ان شاء اللہ عزوجل۔

اس قسط میں صرف عناوین اور ذیلی عناوین میری طرف سے ہیں، بقیہ سب عبارتیں مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ہیں سوائے شروع کی سوانح حیات کے، کہ وہ مجموعہ "نگارشات" کے مرتبین / مؤلفین کے الفاظ ہیں۔ پس میرے اس مضمون میں محض شروع ہی کے چند الفاظ یا جمع و ترتیب اور اس کی ابواب بندی ہے۔ ابواب بندی بھی اس لیے کی گئی ہے تاکہ مسئلہ میں نکھار پیدا ہو اور مولانا کی فکر زیادہ نکھر کر سامنے آئے، جیسا کہ اس کی مثال ہمیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی احادیثِ نبویہ پر ابواب بندی سے ملتی ہے۔

کسی بڑے عالم کے افکار و نظریات کو شائع کرتے ہوئے کوئی وضاحتی نوٹ لگانے میں حرج نہیں ہے، البتہ اختلافی نوٹ لگانے میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ کسی مصنف یا مولف کے کام کا تعارف کرواتے ہوئے اس پر اختلافی نوٹ لگانے کی بجائے، اس اختلاف کا اظہار کسی اور مقام پر کر دینا چاہیے تاکہ قاری کا ذہن منتشر نہ ہو۔ اگرچہ "نگارشات" کے مرتب نے بعض مقامات پر مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کرتے ہوئے حواشی میں اختلافی نوٹس لگائے ہیں، جیسا کہ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر اختلافی نوٹ[1]، یا مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے تفویض کی اصطلاح کو استعمال کرنے پر اختلافی نوٹ[2]، یا مولانا کی طرف بدعتی کے فرض اور نوافل قبول نہ ہونے والی روایت کے بیان کو حواشی میں موضوع قرار دینے کا اختلافی نوٹ[3]، جبکہ یہ روایت معمولی سے الفاظ کے تغیر کے ساتھ اور بعینہٖ مولانا ہی کے بیان کردہ معنی و مفہوم کے مطابق صحیحین میں موجود ہے۔ مرتب کی طرف سے بعض نوٹس وضاحتی بھی ہیں اور وہ مفید

---

١ نگارشات:٣/٦٦

٢ نگارشات:٥/٣٢

٣ نگارشات:٢/٣٣٤

ہیں، لیکن اختلافی نوٹس قاری کے ذہن میں انتشار پیدا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ہم نے اس مضمون میں کسی بھی قسم کا اختلافی نوٹ لگانے سے اجتناب ہی کو بہتر سمجھا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ ہم قاری کو مولانا سے اختلاف کی کوئی جہت مہیا کریں، وہ خود ہی یہ فیصلہ کرے تو کرے۔

۱۔ مولانا اسماعیل سلفیؒ: سوانح، شخصیت اور علمی خدمات

پیدائش اور ابتدائی تعلیم: مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۱۳۱۴ھ بمطابق ۱۸۹۵ء تحصیل وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں ڈھونیکے میں ہوئی[۱]۔ ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے بعد آپ نے مولانا حافظ عبد المنان صاحب وزیر آبادی کی خدمت میں باقاعدہ زانوئے تلمذ طے کیا... مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے استاذِ پنجاب سے صحاح ستہ مکمل اور اصول حدیث میں "شرح نخبۃ الفکر" اور "تفسیر جلالین" پڑھی۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے کمال مہربانی و تلطف سے مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کو روایت کی اجازت دی اور سند بھی عطا فرمائی۔ یہ سند آپ کو ۱۳۳۳ھ میں دی گئی۔

اعلیٰ دینی تعلیم کا حصول: ان دنوں امر تسر میں علوم و فنون کا چرچا تھا۔ اکابرینِ خاندانِ غزنویہ علوم و فنون کا منبع بن چکے تھے۔ مدرسہ غزنویہ میں آپ نے مولانا عبد الغفور غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبد الرحیم غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔ قیامِ امر تسر کے دوران آپ نے مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ (جو قیامِ پاکستان کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی ہوئے) سے فنون کی کتابیں پڑھیں۔ آپ مفتی صاحب موصوف سے بہت متاثر تھے۔ فنون میں ان کے ذوق اور طریقِ تدریس کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فنون میں میری دلچسپی اور درک مفتی صاحب کے طریقِ تدریس کا فیض ہے[۲]۔ امر تسر سے فراغت کے بعد مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ ان دنوں وہاں علامہ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی علمیت کا چرچا تھا۔ مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے بھی کسب فیض کیا... انہوں نے مولانا سلفیؒ کی ذہانت و فطانت کو آن واحد میں پہچان لیا اور انہیں اپنا روحانی بیٹا قرار دیا۔ علامہ سیالکوٹی مرحوم نے اپنی عظیم الشان لائبریری مولانا سلفی کی تحویل میں دے دی اور اس طرح مولانا مرحوم کو قدیم تفاسیر اور نادر علمی کتابوں سے استفادے کا موقع حاصل ہوا[۳]۔

مدرسہ محمدیہ کی بنیاد: آپ ۱۳۳۹ھ بمطابق ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں

---

۱ نگارشات: ۱/ ۵۲

۲ نگارشات: ۱/ ۵۴

۳ نگارشات: ۱/ ۵۴

گوجرانوالہ آئے۔ ان ایام میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث چند نفوس پر مشتمل تھی، مولانا سیالکوٹی نے جماعت کے اراکین سے کہا کہ میں ایک درِّ شہوار تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں، اس کو حفاظت سے رکھنا۔ اس کے بعد آپ نے شہر گوجرانوالہ کو ایسا وطن بنالیا کہ اس شہر میں منبر و محراب کو الحمد للہ چار چاند لگادیے۔ گزشتہ نصف صدی میں کئی انقلاب آئے، مگر آپ اپنے جادۂ مستقیم پر رواں دواں رہے۔ آپ کے پائے عزیمت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ مقام و مرتبہ کی چاہت اور دولت کی طلب آپ کو اپنے مقام سے نہ ہلا سکی۔ مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سماحۃ الشیخ عبد العزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ عبد القادر شیبۃ الحمد کی معرفت آپ کو مدینہ منورہ بلوا بھیجا، مگر آپ نے گوجرانوالہ میں قیام کو ترجیح دی اور اپنی جگہ حضرت العلام جناب مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھجوادیا۔ گوجرانوالہ کی جامع اہل حدیث میں آپ نے مدرسہ محمدیہ کی بنیاد رکھی[1]۔

مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات و تالیفات: مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ اسلامی حکومت کا مختصر خاکہ، ۲۔ مسئلہ حیات النبی ﷺ، ۳۔ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ۴۔ تحریکِ آزادئ فکر، ۵۔ حدیث کی تشریعی اہمیت، ۶۔ مقامِ حدیث قرآن کی روشنی میں، ۷۔ مسئلہ زیارت قبور، ۸۔ شرح سبع معلقات، ۹۔ رسول اکرم ﷺ کی نماز، ۱۰۔ مشکوۃ المصابیح (نصف اول کا ترجمہ و تحشیہ)[2]۔

قبل ازیں مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے جو تحریری مجموعہ جات ہم نے شائع کئے ہیں، ان میں "مقالات حدیث" (۲۰۰۹ء)، "نگارشات" (۲۰۱۱ء)، "مجموعہ رسائل" (۲۰۱۲ء)، "مقالات و فتاویٰ" (۲۰۱۶ء) اور "خطبات" (۲۰۱۷ء) شامل ہیں۔ یہ تمام مجموعات ہم نے موضوعات کے مطابق ترتیب دیے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں انہیں موضوعات سے متعلق مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کا مزید تحریری مواد بھی ملتا گیا، جسے ہم جمع کرتے رہے۔ چنانچہ اب مولانا کی تمام نگارشات کا یہ مجموعہ بہت سے اضافہ جات کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے جو ان کی تحریر کردہ کتب، رسائل، مضامین، فتاویٰ، مکاتیب، مقدمات اور دروس و خطبات پر مشتمل ہے۔ حسبِ سابق ان تمام جلدوں کو ہم نے موضوعات ہی کی ترتیب سے مدون کیا ہے اور ان میں تمام مطبوع و غیر مطبوع تحریروں کو جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ پہلی جلد: "حجیت حدیث"، دوسری: "تحریک آزادی

---

۱ نگارشات: ۱/ ۵۴-۵۵

۲ نگارشات: ۱/ ۵۷-۵۸

فکر"، تیسری: "مجموعہ رسائل"، چوتھی: "مقالات و فتاویٰ"، پانچویں: "مکاتیب و مقدمات"، چھٹی: "نظم جماعت اور دروس و خطابات"، ساتویں: "خطبات جمعہ"، آٹھویں: "شرح معلقات سبعہ"، اور نویں اور دسویں جلد: "شرح مشکاۃ المصابیح" پر مشتمل ہے [1]۔

مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب تحریر: ایک طبیب حاذق کی طرح نشتر بھی چلاتے ہیں، مگر کہیں ٹیس محسوس نہیں ہونے دیتے۔ اپنے مخاطب کا بھرپور تعاقب کرتے ہیں، مگر اس کے ادب و احترام کے منافی کوئی چیز نوک قلم پر نہیں لاتے [2]۔ مولانا اصحاب الرائے اور تقلید جامد کے خلاف بے باک نقاد ہیں، مگر تنقید اس انداز سے کرتے ہیں کہ فریق مخالف برا ماننے کے بجائے قائل ہو جاتا ہے [3]۔ اردو انشاء پردازی میں صاحب طرز تھے، جس میں روانی، سلاست بیانی، الفاظ کا چناؤ، ان کا جڑاؤ، طنز کی پھوار اور پھر محل کے مطابق اشعار کی آمد اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہوتی تھی [4]۔

مولانا کے معمولاتِ زندگی: مولانا اتنی مصروف زندگی گزارتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے کہ آپ ان فرائض سے کیسے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ مسجد کے خطیب اور پانچوں نمازوں کے امام بھی تھے۔ آپ نے مدت العمر قرآن کا درس اس اہتمام سے دیا کہ ناغہ شاذ و نادر ہی ہوا، تبلیغی اور تنظیمی سفر پر تشریف لے جاتے، تو کوشش یہی فرماتے کہ سفر جلد ختم ہو، تاکہ درس قرآن حکیم کے تسلسل میں فرق نہ پڑے۔ گوجرانوالہ میں آتے ہی مولانا نے فجر کے بعد درس قرآن شروع کر دیا تھا، جو سینتالیس برس تک تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ درس کے لیے یومیہ سامعین دو اڑھائی سو سے کم نہ ہوتے تھے۔ رمضان المبارک میں یہ تعداد پانچ سو کے قریب ہو جایا کرتی تھی۔ درس قرآن مجید اور خطبہ میں بھی ترتیب کے ساتھ دوسرے دور کا اٹھارواں پارہ قریب الختم تھا۔ اس درس کے بعد تجار اور کاروباری لوگوں کی ایک جماعت آپ سے باترجمہ قرآن مجید پڑھتی تھی، بعد ازاں مدرسہ محمدیہ کے اسباق شروع ہو جاتے تھے اور آپ اہم کتابیں خود پڑھاتے تھے۔ اثنائے مصروفیت ہی میں مضمون نویسی، مقالہ نگاری، خطوط کے جواب اور فتویٰ تحریر فرماتے تھے۔ شہر کی سیاسی و معاشرتی تحریکوں میں

---

۱ نگارشات: ۱/ ۲۴
۲ نگارشات: ۱/ ۴۰
۳ نگارشات: ۱/ ۴۱
۴ نگارشات: ۱/ ۵۷

حصہ بھی لیا جاتا تھا، ملک کی تحریکوں میں پورے انہماک کے ساتھ حصہ لیتے تھے اور حوادث میں باحسن وجوہ خدمات سرانجام دیتے تھے[1]۔

مولانا کی خدمت اور سادگی: مولانا اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۲۱ء میں مسجد اہل حدیث میں تدریس پر مقرر ہوئے۔۔مولانا کی طبیعت نہایت سادہ اور خدمت گزار تھی، اکثر صبح کی نماز سے پہلے خود اپنے ہاتھ سے ویل پمپ سے وضو کے لیے پانی بھرتے۔ مسجد کا کام ایک جذبے سے کیا اور طبیعت ایسی رسا تھی کہ جو طالب علم صرف ایک سال تعلیم حاصل کرتا، وہ ضرور اہل حدیث ہو جاتا، حالانکہ آپ نے کبھی کسی کو ترغیب نہیں دی، لیکن آپ کی طبیعت سے متاثر ہو کر مسلک اہل حدیث اختیار کر لیتے۔ طبیعت میں لالچ نہیں تھا، بلکہ کام کرنے کا جذبہ تھا اور اپنے طلبہ کو کہا کرتے تھے کہ بیٹا روٹی کے پیچھے نہ جانا، بلکہ جہاں اللہ تعالیٰ کام کرنے پر لگا دے، وہاں سے اٹھنا نہیں۔ دوسری جگہ خواہ کتنے زیادہ پیسے ملیں، جگہ چھوڑنی نہیں، کیونکہ جو کھیتی لگائی جاتی ہے، اس کی رکھوالی نہ کی جائے، تو پھل نہیں دیتی۔ جب مدینہ یونیورسٹی بنی تو سعودی حکومت نے پیش کش کی کہ آپ وہاں تعلیم پر مقرر ہو جائیں اور تین ہزار روپیہ تنخواہ دینے کو تیار تھے۔ مولانا نے فرمایا: میں اپنے بڑھاپے میں بکاؤ مال نہیں بننا چاہتا۔ حالانکہ اس وقت مولانا کی تنخواہ صرف ۱۷۵ روپے تھی[2]۔

مولانا میں خیر خواہی کا جذبہ: ساری زندگی ہر کسی کی خیر خواہی کو مقصدِ زندگی بنا رکھا تھا، بلکہ خیر خواہی والی بات منہ پر کرنے سے بھی ہچکچاتے نہ تھے۔ ایک دفعہ گکھڑ کے نارمل سکول سے کچھ علماء آئے، تعارف کروانے والے نے ان کا تعارف کروایا کہ بہت پرہیز گار نمازی آدمی ہیں، آپ نے کہا یہ کوئی ان کی تعریف نہیں ہے، نماز تو ہمارا علماء کا پیشہ ہے، اگر ہم لوگ نماز نہ پڑھیں تو دنیا والے ہی ہمیں جینے نہ دیں۔ علماء کی اچھائی کا معیار یہ ہوتا ہے کہ لین دین کے معاملات میں کھرا ہو۔ اور دنیادار جو لوگ دکانیں کرتے ہیں، وہ اکثر لین دین کے معاملات میں کھرے ہوتے ہیں، ان کی اچھائی کا معیار نماز ہوتی ہے۔۔استاذی المکرم حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ پر قتل کا مقدمہ بن گیا، تو مولانا صاحب شہر کے چیدہ چیدہ حضرات سے روپے اکھٹے کر کے کیس کی خود پیروی کرتے رہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کر دیا۔[3]

---

۱ نگارشات: ۱/ ۵۶-۵۷

۲ نگارشات: ۱/ ۶۵

۳ نگارشات: ۱/ ۶۷

مولانا کا ایک طالب علم کو نصیحت آمیز مکتوب: محترم مولانا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کئی دن ہوئے خط ملا تھا، مصروفیت اور علالت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ تبلیغ میں الفاظ کی شدت اور فتوی بازی سے پرہیز کریں، اس سے نفرت بڑھتی ہے۔ ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵] پر عمل کریں۔ لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھائیں۔ غم وخوشی میں ان سے مناسب ربط قائم رکھیں، یہ بے حد مؤثر چیز ہے۔ اخراجات محدود رکھیں اور قناعت سے کام لیں۔ قرض اور سوال دونوں میں آبرو کو خطرہ ہے۔ اکثر علماء اسی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں۔ اپنے اخراجات کو کنٹرول کرنے سے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منتظمین سے تعاون فرمائیں۔ جماعت میں پارٹی بازی نہ ہونے پائے، اس کا پورا پورا خیال رکھیں۔ بعض لوگ اختلاف برائے اختلاف کے عادی ہیں، ان سے اغماض کرنا چاہیے۔ نماز باجماعت اور رات کو بیداری کی عادت ڈالیں، اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔[1]

مولانا کی سیاسی زندگی: پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے مطالبے میں ہر قدم پر مولانا غزنوی کے ساتھ جماعت کی نمائندگی کی، چنانچہ اس کمیٹی کے آپ رکن تھے جو ۱۹۵۲ء میں اسلامی آئین کی تشکیل کے لیے بنائی گئی تھی۔ ۱۹۵۳ء کی تاریخی تحریک ختم نبوت کے دوران مجلس عمل تحفظ ختم نبوت میں جمعیت کے تین نمائندے تھے: ۱۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ، ۲۔ مولانا سید محمد داود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ، ۳۔ مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ۔ تاہم اس سلسلے میں قید وبند کا شرف مولانا محمد اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آیا۔[2]

مولانا کی تحریکی اور تنظیمی زندگی: مولانا نے تحریک خلافت سے لے کر تحریک آزادی تک تمام تحریکوں میں کام کیا اور متعدد بار جیل گئے۔ تحریک ختم نبوت کے مرکزی مجلس عاملہ کے رکن تھے... مولانا صاحب تعلیم میں اتنے مشغول رہتے کہ میں نے ایک مرتبہ کہا: مولانا اب دوبارہ حج کو جانے کا ارادہ نہیں؟ فرمایا حج ایک ہی مرتبہ فرض ہے۔ اب اس کے علاوہ اور دینی فرائض بہت ہیں... پاکستان بن جانے کے بعد خود مولانا صاحب کو جماعتی نظم کا خیال پیدا ہوا، تو مولانا داود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو ملے۔ دونوں نے مل کر جمعیت اہل حدیث کو منظم کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ۱۹۴۹ء میں ہی ایک باقاعدہ باڈی بنادی، جس کے پہلے صدر (بعد میں امیر کے لفظ

---

۱ نگارشات: ۱/ ۶۹

۲ نگارشات: ۱/ ۵۶

سے تبدیل کر دیا گیا) مولانا داود صاحب غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور ناظم اعلیٰ مولانا اسماعیل صاحب سلفی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ مولانا ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک ناظم اعلیٰ رہے اور مولانا داود صاحب کے فوت ہونے پر ۱۹۶۲ء سے تا حیات ۱۹۶۸ء تک امیر کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کے تیسرے پہر فوت ہوئے۔[1]

رحلت ووفات: ۲۵ ذوالقعدہ ۱۳۸۷ھ بمطابق ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء منگل کے دن نماز عصر کے بعد یکا یک طبیعت بگڑی اور راہ گزر عالم جاوداں ہوئے۔[2]

۲- بر صغیر میں اہل حدیث کی تاریخ اور سلفی تحریک

اہل حدیث؛ تاریخ کے مختلف ادوار میں: ائمہ اربعہ کی ولادت اور وفات کے سنین پر غور کیا جائے تو ۸۰ھ سے شروع ہو کر امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ تک ختم ہوتا ہے۔ ان ایام کے بعد برسوں اس جمود اور تقلید کا پتہ نہیں چلتا جسے آج کل واجب کہا جا رہا ہے اور اس سے اعراض کو بے دینی وغیرہ القاب سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس پر فخر یا اس کی طرف دعوت کسی صورت میں بھی چوتھی صدی سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ فتح ہند سے پہلے پہلا لشکر جو ساحل ہند پر اترا، اس وقت ان مروجہ مذاہب کا نام ونشان عرب میں تھا نہ عجم میں۔ تقلید ائمہ کے موجودہ انداز سے ذہن بالکل خالی تھے۔ معلوم ہے، ہند پر پہلا حملہ ۹۲ھ میں ولید بن عبد الملک کی حکومت میں ہوا۔ عرب میں تو اس وقت علماء تابعین کی کثرت تھی۔ ائمہ اربعہ کا خیال بھی اس ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ خراسان، ایران اور فارس میں اس وقت ائمہ حدیث کی کثرت تھی۔ احادیث کا حفظ وضبط، نقل وروایت ان حضرات کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ حدیث کی جمع وتدوین کے اس دور میں ائمہ کی فقہوں کا احساس بھی موجود نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بلا تخصیص وتعیین اہل علم کی نظر میں تھے۔ وہ مدار استناد تو تھے لیکن تقلید کا اس وقت شائبہ تک نہ تھا۔ اس وقت کی شافعیت اور حنفیت محض اساتذہ کے جزوی تاثرات تھے۔[3]

بر صغیر پاک وہند میں اہل حدیث کی آمد: معلوم ہے کہ ہندوستان میں فاتحین اسلام دو راستوں سے آئے، سندھ کی راہ سے اور ایران کی راہ سے۔ پہلا لشکر محمد بن قاسم کی قیادت میں پہلی صدی کے اواخر میں پہنچا۔ اس وقت ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہ کے سوا باقی ائمہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کے لیے

---

۱ نگارشات:۱/۶۶

۲ نگارشات:۱/۶۱

۳ نگارشات:۲/۱۶۱-۱۶۲

یہ دور طالب علمی کا تھا اور امامت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لشکر اہل حدیث تھا اور موجودہ تفریق سے بے خبر۔ ان کا مسلک تقریباً وہی تھا جو آج کل اہل حدیث کا ہے، یعنی بلا تخصیصِ شخص مسائل اہل علم سے پوچھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ اسی لیے عامۃ المسلمین میں اس وقت تعصب ناپید تھا۔ دوسرا حملہ ایران کی راہ سے ہوا۔ یہ فاتح عموماً حنفی تھے۔ انہی کی وجہ سے ہندوستان میں حنفیت پورے زور سے پہنچی۔ اور اس وقت تک احناف کی ملک میں کثرت ہے اور عوام وخواص میں عصبیت بھی ہے۔ الا من رحم![1]

گیارہویں صدی ہجری کی اہل حدیث تحریکیں: گیارہویں اور بارہویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑی فیاضی کے ساتھ اپنی رحمت کی اور عرب و عجم پر اس کی شفقت کے سائے اُمنڈ آئے، اس وقت کئی دینی تحریکوں نے جنم لیا۔ نجد میں نجدی دعوت کی بہار آئی، اس دعوت کے امام نابغہ ُروز گار امام محمد بن عبد الوہاب نجدی تھے۔ سعودی عرب کے شاہی خاندان نے ان کی بھرپور مدد کی۔ ہمارے علم کے مطابق یہ دعوت پہلی خالص دینی دعوت تھی، اس کے بعد دینی سیاسی دعوت بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ان علاقوں میں اس دعوت کو قبولیت بخشی، ان تمام ممالک میں اس دعوت کے حامی اور ہمنوا موجود تھے اور یہ علاقے اب تک دعوتِ محمدی کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حالات کی اصلاح فرمائے۔ ان کو فحاشی، عریانی، بدکاری، حیاباختگی، دین بے زاری اور اسلامی دعوت پر وطن پرستی کی ترجیح اور فرعونیت پسندی جیسی گمراہیوں سے محفوظ رکھے جو ایک وبا کے طور پر پھیل رہی ہیں۔

دوسری دعوت: اسلامی بیداری اور وحدتِ امت کی تحریک جس کا آغاز زعیمِ اسلام جمال الدین افغانی نے سید محمد عبدہ، سید رشید رضا مصری اور اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا۔

تیسری دعوت: ہندوستان میں سلفی تحریک۔ ان تینوں تحریکوں کی کوششیں، اعمال اور حالات اگرچہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف تھے، لیکن یہ سب تحریکیں دو مقاصد میں متفق تھیں: ایک شرک و بدعات کی گندگی سے پاک خالص توحید کی دعوت اور دوسرے کتاب و سنت کی دعوت، تقلید و جمود سے اجتناب اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم کے منہج و مسلک کی پیروی۔[2]

---

۱ نگارشات: ۲/ ۱۰۴

۲ نگارشات: ۵/ ۱۵۳

اصلاحی تحریکوں کا کردار: نجد میں شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب اور سعودی خاندان۔ ایران، افغانستان، مصر اور شام میں جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ۔ ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان اور تلامذہ۔ ان تمام مصلحین نے اپنے ماحول کے مطابق اپنے حلقوں میں کام کیا اور اپنی مساعی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ علمی اور سیاسی طور پر کامیاب ہوئے۔ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے کامیاب، قابل اور مخلص دماغوں کو تربیت دی جن کی وجہ سے مصر و شام علم و اصلاح کا گہوارہ قرار پایا اور ان کے فیوض نے ذہنوں کی کایاپلٹ دی۔ ان حضرات کی کوششوں نے یورپ کے مادی منصوبوں کے سامنے ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن کو عبور کرنا ابلیسی طاقتوں کے لیے آسان نہیں۔ مصر و شام کی آزادی اور دینی تحریکات میں ان مساعی کو بڑا دخل ہے جن کا آغاز مجددِ وقت شیخ جمال الدین افغانی اور سید عبدہ نے فرمایا اور اس کی تکمیل میں سید رشید رضا، علامہ مراغی، سعد زغلول، امیر شکیب ارسلان ایسے بیدار مغز لوگوں نے شب و روز محنت فرمائی اور کافی حد تک ان کو کامیابی ہوئی۔[1]

برصغیر میں تحریک اہل حدیث کا آغاز اور شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ: گیارہویں صدی کے آغاز میں ایک مدتِ مدید کے بعد ہندوستان میں جدید سلفی تحریک کے آثار ظاہر ہوئے۔ سب سے پہلے جس نے بدعتِ تقلید کی بندشوں کو توڑا اور آزادیِ فکر کی نوا بلند کی، وہ اس صدی کے مجدد اور اس تحریک کے سرخیل، مجدد الفِ ثانی سید احمد بن عبد الاحد فاروقی حنفی سرہندی (۱۰۳۴ھ) تھے۔ وہ گو مسلکاً حنفی تھے، لیکن جمود کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ ان کا سب سے بڑا ہدف مروجہ بدعات کا خاتمہ تھا۔ آگے چل کر بیہقیِ زمانہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) مرزا مظہر جانِ جاناں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے فاضل بیٹوں نے اس سوچ اور منہج کو آگے بڑھایا۔ ان سب نے حالات کی ناہمواری اور مساعدت کے باوجود رائج بدعات کی مخالفت کی اور ایک مخصوص مذہب کی تقلید اور پابندی کے خلاف آواز بلند کی۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفہیمات'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ فقہائے محدثین کے مذہب کو اختیار کرتے ہیں اور صوفیوں کی رسوم سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس طرح ان کے فرزندوں نے فقہ اور اصولِ فقہ پر تنقید کی۔ ان کے حنفیت کی طرف رجحان سے دھوکا نہ کھائیں، یہ اس وقت کے حالات اور عوام کے رائج الوقت تقلیدی مزاج پر جمود کی وجہ سے تھا۔[2]

---

۱ نگارشات:۳/ ۶۶

۲ نگارشات:۵/ ۱۵۲-۱۵۳

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شرک وبدعات اور فقہی جمود کے خلاف کاوشیں: حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد بن زین العابدین الفاروقی (متوفی ۱۰۳۴ھ) دسویں صدی کے اواخر ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کئی قسم کے جمود پائے جاتے تھے، جن کی اصلاح کے لیے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جرات مندانہ قدم اٹھایا۔ سیاسی جمود، رسوم وعادات میں مشرکانہ جمود، تصوف میں جمود اور فقہی جمود۔ اکبر اعظم کا انداز ابتداء میں اسلامی تھا۔ اس نے شیخ محمد طاہر پٹنوی مؤلف "مجمع البحار" کے سر پر پگڑی اس شرط پر رکھی کہ ان کے بجائے بادشاہ خود بدعات کی بیخ کنی کرے گا[1]، لیکن عیاش رفقاء اور ملا مبارک کے خانوادے نے اسے برباد کر دیا۔ بدعات کیا مٹیں، وہ کفر کو از سر نو واپس لانے میں مشغول ہو گیا۔ ہندو مت اور رفض کی ملی جلی رسوم، شاہی خاندان میں پائی جانے لگیں اور اس کا اثر رعایا پر بھی ہوا۔ علماء سے ملا مبارک کا خاندان ایوانِ شاہی پر قابض تھا۔ اکبر کی لگام علمی طور پر انہی حضرات کے ہاتھ میں تھی اور جب دربار پر قبضہ ملا دوپیازہ ایسے مسخروں اور بیربل ایسے بے دین لوگوں کا ہو تو دینی بصیرت، تفقہ، تقویٰ، تدین کہاں سے آئے گا؟ برہمنوں کی نقالی، تیجے، دسویں، چہلم اور گیارہویں اصل دین قرار پا سکتا تھا جو ہندو رسوم کی ایک صورت ہے۔ شرک کی اصل بنیاد عموماً خالق اور مخلوق کی صفات میں عینیت یا تشابہ رہا ہے، جس کا اوتار، حلول، تجسم اور وحدت الوجود نام رکھا گیا۔ مسیحی حضرات نے جب مسیح کی ابنیت کا دعویٰ کیا تو تجسم کی آڑ لی۔ یہاں بھی حلول اور وحدت الوجود کے باطل عقیدے کو رواج دیا گیا۔ آج ہمارے عوام میں عرب بلا عین اور احمد بلا میم کی شہرت اسی عقیدے کے برگ و بار ہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ مسلک کے لحاظ سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے پختہ تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کی روش میں اس قدر وسعت ہے کہ آج کل حضراتِ احناف کے دونوں شعبوں، حضراتِ "دیوبند" اور حضراتِ "بریلی" کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ حضراتِ صوفیہ سے محبت کے ضمن میں حضراتِ بریلی مجدد صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں، لیکن بدعات کی ترویج کے سلسلے میں وہ حضرت مجدد کی پروا بھی نہیں کرتے، بلکہ ان کے ہاں مذہب کا بالکل ایک نیا تصور ہے جس کے لیے نہ وہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح تقلید کرتے ہیں، نہ حضرت مجدد کی اقتداء۔[2]

---

۱ ابجد العلوم، ص:۸۹۶

۲ نگارشات:۵/ ۲۱۶-۲۱۷

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا بدعات کا رد: حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں بدعات کے خلاف کس قدر کڑی تنقید فرمائی ہے۔ بدعت کی حفاظت کے لیے حسنہ اور سیئہ کی تقسیم اہل بدعت کو قلعے کا کام دے رہی تھی اور عز بن عبد السلام نے جب سے اس تقسیم کی نشاندہی کی تھی، اس کے بعد سے ہندوستان میں حضرت مجدد ہی تھے جنہوں نے یہ قلعہ پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ سجدۂ تعظیم کے خلاف گوالیار کے قلعے میں تین سال قید گوارا فرمائی لیکن سجدۂ تعظیم کی گندگی سے اپنی مقدس پیشانی کو آلودہ نہیں فرمایا۔ فقہی مسائل میں حضرت کے کچھ اختیارات تھے۔ دوسرے علماء کی مخالفت کے باوجود متاخرین اور متقدمین کی راہ پر رجماً بالغیب چلنے سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے انکار فرمایا۔ اس کی زندہ شہادت حضرت کے مایہ ناز شاگرد مرزا مظہر جانِ جاناں موجود ہیں جنہوں نے فاتحہ خلف الامام، رفع الیدین عند الرکوع، وضع الیدین علی الصدر ایسے مشہور مسائل میں فقہائے محدثین کی راہ اختیار فرمائی اور فقہ العراق کے ساتھ کلی تعاون سے انکار کر دیا۔ (ابجد العلوم: ۳/ ۹۰۰ و محبوب العارفین، ص: ۷۶) قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ فرمایا۔ ان کی تصانیف ارشاد الطالبین اور تفسیر مظہری شاہد ہیں کہ حنفی ہونے کے باوجود بدعات اور عبادِ قبور کے خلاف ان کا لہجہ کس قدر تلخ ہے اور بدعی رسوم سے کس قدر نفرت! شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ، البلاغ المبین، مصفی و مسوّی، انصاف، عقد الجید اور تحفۃ الموحدین میں فقہی جمود، بدعات اور مشرکانہ رسوم کے خلاف ایسی حکیمانہ روش اختیار فرمائی جس سے حقیقت بہت حد تک واضح ہو گئی۔ اصولِ فقہ کی بعض مسلمات پر ایسی میٹھی تنقید فرمائی جس سے ذہین طبائع کو جرأت پیدا ہو۔ ازالۃ الخفا میں بدعتِ تشیع کو اس قدر عیاں فرمایا کہ ذہین اور دانشمند طبائع کو محبتِ اہل بیت کے عنوان سے دھوکا دینے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ ان مختصر ارشادات سے اس تحریکِ اصلاح اور اقامتِ دین کا مزاج آپ کو سمجھنا مشکل نہیں۔[1]

بدعت کی تقسیم اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف: تقریباً تھوڑی دیر پہلے ہندوستان کی قسمت جاگی اور رشد وہدایت کی سوئی ہوئی طاقتوں نے انگڑائی لی۔ اس کی بیداری کا آغاز سید احمد سرہندیؒ نے گیارھویں صدی ہجری میں فرمایا۔ بدعات کے خلاف کھلی جنگ لڑی۔ بدعت کی تقسیم کا حیلہ عز بن عبد السلام کے وقت سے آرہا تھا۔ لوگ بدعت کو حسنہ کہہ کر جواز کی راہ پیدا کر لیتے تھے۔ حضرت مجدد نے اسے تار تار کر دیا اور فرمایا کہ جب

---

۱ نگارشات: ۳/ ۶۸

آنحضرت ﷺ ہر بدعت کو ناپسند فرماتے ہیں تو اسے حسنہ کہنے کا حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔ شرعاً کوئی بدعت حسنہ نہیں کہلا سکتی۔ سنت سے محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ محبت کی سچی دلیل ہے۔ بدعتی کتنا ہی عابد و زاہد ہو، بارگاہ نبوت میں وہ کسی احترام کا مستحق نہیں![1]

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی وسعت نظر اور آزادی فکر: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پسندی اور وسعتِ نظر کا یہ اثر تھا کہ ان کے لختِ جگر بھی بعض فرعی مسائل میں اختلاف کرتے اور اس کا اظہار کسی تصادم اور مناظرے کے بغیر فرماتے۔ یہی حال حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ اور مستفیدین کا ہے۔ وہ فرعی مسائل میں بڑی آزادی سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بعض اہم مسائلِ مختلف فیہ پر اتفاق فرماتے اور اس کے باوجود وہ حنفی کہلانے میں مسرت محسوس کرتے۔ یہ اس علمی جہاد کا اثر تھا جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فقہی جمود کے خلاف فرمایا۔ یہ تذکرہ "ابجد العلوم" میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے۔[2]

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے دوسرے امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ: اہل حدیث کی دعوت ہندوستان میں تقریباً ۱۱۴۳ھ میں شروع ہوئی۔ ابتداء میں نشر و اشاعت کی یہ سہولتیں مہیا نہ تھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کی تصانیف اور تدریس ہی اس وقت آلہ مکبر الصوت کا نعم البدل تھیں۔ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف بھی اپنے ماحول سے کافی متاثر ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ اور باقی تصانیف میں بہت فرق ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے تصوف میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی اصل بہ صراحت سنتِ صحیحہ میں نہیں مل سکتی۔ ریاضت کی بعض مشقیں قولِ جمیل سے شروع ہو کر صراطِ مستقیم مؤلفہ حضرت سید احمد شہید تک کم و بیش ایسی ہیں جن کا سلف سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ تفہیماتِ الٰہیہ میں بعض ایسی چیزیں موجود ہیں جنہیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے ملفوظات اور ان کے مقامِ تسنن کی رفعت میں تطبیق کافی دقت کا موجب ہو جاتی ہے۔[3]

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی شرک و بدعت کے رد میں تعلیمات: قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مسلکاً حنفی ہیں، مشرباً صوفی ہیں۔ حدیث پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی تمام طبقوں

---

۱ نگارشات: ۲/ ۱۱۰

۲ نگارشات: ۵/ ۲۱۸-۲۱۹

۳ نگارشات: ۴/ ۳۴۳

میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں گہری عقیدت ہے۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ، انابت الی اللہ کے لحاظ سے ان کا مقام اپنے اقران میں بہت اونچا ہے۔ رَحِمَهُ اللهُ وَرَضِيَ عَنْهُ وَرَفَعَ دَرَجَتَهُ۔ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں: ''اگر کوئی کہے کہ خدا اور رسول ﷺ اس عمل پر گواہ ہیں، کافر ہو جائے گا۔ اولیاء معدوم کو موجود نہیں کرسکتے، موجود کو معدوم نہیں کرسکتے۔ ان کی طرف ایجاد یا اِعدام، رزق دینے والا، اولاد دینے، مصیبت اور بیماری دور کرنے کی نسبت کرنا کفر ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: 'اے محمد ﷺ! کہہ دو میں اپنے لیے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے۔' خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، نہ اس کے سوا کسی سے مدد طلب کرے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ہے کہ اے اللہ! ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ﴿إِيَّاكَ﴾ میں حصر ہے۔ اولیاء اللہ کے لیے کوئی نذر درست نہیں کیوں کہ نذر عبادت ہے۔ اگر کوئی نذر ایسی مانے تو اسے پورا نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ معصیت سے جہاں تک ممکن ہو، بچنا چاہیے۔ اور قبروں کا طواف درست نہیں کیوں کہ طواف نماز کے حکم میں ہے اور یہ بیت اللہ کا حق ہے۔ زندہ اور مردہ ولیوں اور نبیوں سے دعا کرنا درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: دعا ہی عبادت ہے۔ پھر ارشادِ خداوندی ہے: ''مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں جائیں گے۔'' اور جو لوگ یہ وظیفہ کرتے ہیں: ''یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ' یا 'خواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً للہ!' یہ کہنا جائز نہیں، شرک اور کفر ہے۔'' اس کے بعد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ [الأعراف: ۱۹۴] ''جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں۔'' ''یہ آیت صرف بت پرستوں کے لیے نہیں کیوں کہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں عموم ہے، احکام میں الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔'' اس کے بعد فرماتے ہیں: ''اگر کوئی کلمہ توحید کے ساتھ علی ولی اللہ، ابو بکر ولی اللہ کو ملائے تو اسے تعزیر لگائی جائے گی، اسی طرح ذکر اور وظیفہ کے طور پر یا محمد، یا محمد کہنا ناجائز ہے۔''[1]

نوٹ: ارشاد الطالبین فارسی میں ہے، اختصار کے لیے اردو میں ترجمہ کر دیا اور تلخیص بھی۔[2]

شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شرک و بدعت کے رد میں تعلیمات: آیت ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ

۱ ارشاد الطالبین، ص:۱۹

۲ نگارشات: ۳/ ۵۷-۵۸

تَعْلَمُوْنَ﴿۲۲﴾ [البقرۃ: ۲۲] کی تفسیر میں شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿اَنْدَادًا﴾ کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں۔ ان میں چوتھی قسم میں قبر پرست حضرات کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں: ''چہارم: پیر پرستاں گویند چوں مردِ بزرگے کہ بہ سبب کمالِ ریاضت و مجاہدہ مستجاب الدعوات و مقبول الشفاعت عند اللہ شدہ بود ازیں جہاں می گزرد وروحِ اوراقوتِ عظیم ووسعتِ بس فخیم می رسد ہر کہ صلاۃ اوراںرزخ سازد یادر مکانِ نشست و برخاستِ او سجود و تذللِ تام نماید روحِ او بہ سببِ وسعت و اطلاق بر آں مطلع شود و در دنیا و آخرت در حقِ او شفاعت نماید[1]۔''

''پیر پرست کہتے ہیں کہ بزرگ آدمی، کثرتِ ریاضت اور مجاہدے کی وجہ سے اس کی دعائیں اور سفارش اللہ کے ہاں زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اس دنیا سے رخصت کے بعد اس کی روح میں بے حد قوت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس کی صورت کو برزخ بنایا جائے، یا اس کی نشست گاہ اور قبر پر عجز و انقیاد سے سجدہ کیا جائے، اس کی روح کو وسعتِ علم کی بنا پر اطلاع ہو جاتی ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے حق میں سفارش کرتی ہے۔''
اس قسم کی استمداد اور اعانت کو شاہ صاحب ''نِدّ'' سمجھتے ہیں اور اسے شرک تصور فرماتے ہیں۔[2]

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے تیسرے امام شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ: میرا یہ گمان ہے کہ بلادِ ہند میں سلفی تحریک کے بانی مبانی شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ ان کا جہاد اور امت میں فساد کے وقت سنت کا اعلان ہے۔ ہمارے علاقوں میں یہ سنتیں غیر معروف تھیں۔ ان پر عمل کرنا ہاتھ میں آگ کے انگارے پکڑنے کے مترادف تھا۔ بعض عام لوگ احناف اور وہابیوں کے درمیان یہی فرق خیال کرتے تھے بلکہ یہ کفر اور اسلام کے درمیان خطِ امتیاز تھا۔ اسی طرح شاہ صاحب نے ''تقویۃ الایمان'' میں جو فرمایا ہے اسے بھی کفر و اسلام کا معیار قرار دے رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات غیر موافق تھے اور فضا غبار آلود تھی۔ ہر طرف شر پھیلا ہوا تھا لیکن انھوں نے انجام سے بے پروا ہو کر پردے چاک کر دیے اور ببانگِ دہل اعلان کر دیا۔ یہ ہے فرق عام علماء اور ایک مجدد کے درمیان۔ مجدد حالات سے واقفیت رکھتا ہے اور انہی کے مطابق گفتگو کرتا ہے[3]۔

---

۱ تفسیر عزیزی: ۱/ ۱۵۱
۲ نگارشات: ۳/ ۵۶
۳ نگارشات: ۵/ ۱۲۶

خاندانِ دہلی اور حنفیت: فروعِ فقہیہ میں حنفی مسلک کا التزام خاندان میں حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے ہی اٹھ چکا تھا۔ بعض مشہور مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند نہ تھے، جیسے قراءتِ فاتحہ خلف الامام، چناں چہ حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ نمازِ جنازہ اور دوسری نمازوں میں اس کا التزام فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قصہ اور بھی عریاں کر دیا، چناں چہ مولانا شاہ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی کا ورودِ دہلی، آمین بالجہر کی نزاع اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ مشہور واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فتووں میں بھی فاتحہ کے متعلق مسلکِ شافعی کی کھلی حمایت پائی جاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو: فتویٰ مطبوعہ کلکتہ) حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقلیدِ جامد کے اس پہلو کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا۔ "تنویر العینین في إثبات رفع الیدین" لکھ کر حنفی مسلک کی حمایت سے بالکل دستکش ہو گئے اور رفع عند الرکوع وبعد الرکوع کو ترکِ رفع پر ترجیح دی، جیسے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی "حجۃ اللہ البالغۃ" میں ظاہر فرما چکے تھے[1]۔

اظہارِ حقیقت: اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں حنفی مسلک کے پورے پابند بھی تھے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے لشکر میں دونوں فریق یا دونوں مسلک کے آدمی دوش بدوش سکھوں سے لڑتے تھے اور آپس میں ان مسائل پر کوئی ادنیٰ سی مخاصمت یا آویزش بھی نہ ہوتی تھی، اور حق بھی یہی ہے۔ معاملہ ایک سنت پر عمل یا اس کے ترک سے زیادہ نہیں اور نہ ہی حنفی اور اہلِ حدیث میں کفر و اسلام کا فرق ہے (تقلیدِ شخصی پر جمود سے قطع نظر)۔ ایسے اختلافات سلف سے خلف تک موجود رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر نہ کسی کی تکفیر عمل میں آئی نہ تفسیق۔ شخصی اجتہاد یا ترجیح سے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر ایک اپنی تحقیق اور صواب دید پر عمل کرنے میں آزاد تھا[2]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے وارث: ہندوستان میں اللہ تعالیٰ نے اس تحریک کو واقعۂ بالا کوٹ (۱۲۴۶ھ) کے بعد شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۲۶۳ھ) کے نواسے شاہ محمد اسحاق، پھر ان کے شاگرد سید نذیر حسین محدث دہلوی (۱۳۲۰ھ) اور ان کے شاگرد مولانا بشیر احمد سہسوانی (۱۳۲۶ھ)، حافظ عبد اللہ غازی پوری (۱۳۳۷ھ) مجاہدِ اعظم مولانا ابراہیم آروی، مولانا عبد العزیز رحیم آبادی، مولانا شریف حسین محدث دہلوی (۱۳۰۴ھ)، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا عبد الرحمان مبارک پوری (۱۳۵۳ھ)، مولانا عبد اللہ غزنوی اور ان

---

۱ حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۸

۲ نگارشات: ۵/۲۰۸

کے قابل و فاضل بیٹوں، حافظ عبد المنان وزیر آبادی، مولانا غلام حسن سیالکوٹی، مولانا عبد القادر قصوری، مولانا اسماعیل دلاوری، مولانا فضل حق دلاوری، مولانا عبد القادر پشاوری اور ان کے سوا بے شمار علمائے اہلِ حدیث کے ہاتھوں پورا کیا، جن کی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ انھوں نے ہندوستان کے کونے کونے میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے علومِ سنت کا احیا اور قال اللہ و قال الرسول کی آوازیں بلند کر دیں۔ اس تحریک نے علامہ محمد بن علی شوکانی (۱۲۵۰ھ) کے شاگردوں پر مشتمل یمنی سلفی تحریک سے بھی بھرپور قوت حاصل کی۔ علامہ عبد الحق بنارسی (۱۲۸۶ھ) اور مجاہدِ عظیم مولانا ولایت علی بہاری (۱۲۶۹ھ) ایک مدت تک علامہ شوکانی کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔ مشہور شاعر علامہ فاخر زائر الہٰ آبادی کا تقلید کی مذمت اور اسلاف کے منہج کی دعوت کے موضوع پر ایک دیوان ہے، نواب صدیق حسن خان نے اس کی تلخیص کی ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خان قنوجی بھی علامہ شوکانی اور صنعانی کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے والوں میں شامل ہیں، وہ جب حجاز گئے تو ان کی قیمتی کتابیں لے کر آئے[1]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے مختلف دھارے: اس تحریک کے اہم عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں، حضرت مولانا فاخر الہ آبادی، آزاد بلگرامی، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ، مولانا شاہ عبد العزیز، مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ عبد القادر، مولانا شاہ عبد الغنی، حضرت سید احمد شہید، مولانا شاہ اسماعیل، مولانا عنایت علی، مولانا ولایت علی، مولانا عبد الحی بڈھانوی۔ ان میں بعض علماء حنفی ہیں لیکن عقیدتاً اہل حدیث۔ بعض عمل و عقیدہ دونوں میں حنفی، بعض دونوں میں اہل حدیث لیکن اس اختلاف کی نمایش ان حضرات نے کبھی نہیں فرمائی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب کا تفسیر مظہری میں رجحان فقہ حنفی کی طرف ہے لیکن بدعت کی مخالفت میں کوئی لچک نہیں۔ ارشاد الطالبین میں قبر پرستی اور قبور پر چراغاں اور انھیں چونا گچ کرنے کے متعلق ان کی رائے بہت واضح ہے۔ آج کے ارباب دیوبند کی طرح ان میں لچک اور مداہنت نہیں۔ آج بعض اکابر دیوبند کے افکار کا رجحان زیادہ تر بریلویت کی طرف ہے۔ وہ اہل توحید اور اصحاب سنت سے زیادہ اہل بدعت کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔[2]

تحریک اصلاح و جہاد اور مختلف دینی نظریات: اس وقت اسلام کے نام سے چار جماعتیں ہندوستان میں

---

۱ نگارشات: ۵/ ۱۵۳-۱۵۴

۲ نگارشات: ۲/ ۱۱۱

موجود تھیں: اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ۔ اس تحریک کی بنیاد چوں کہ توحید و سنت پر تھی، اس لیے سید احمد شہید کے عساکر میں اہل حدیث اور دیوبندی مکتبِ خیال کے آدمی شامل تھے، بریلوی اور شیعہ حضرات اس میں بالکل شامل نہ تھے، بلکہ وہ کھلی مخالفت کرتے رہے، ان کے فتوے میدانِ جنگ تک پہنچتے رہے اور بد دلی اور اختلاف کا موجب بنتے رہے۔[1]

تحریک حریت و جہاد کے رفقاء کا اتحاد: سید احمد شہید کے لشکر میں دونوں مکاتبِ فکر کے آدمی شامل تھے۔ شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اہل حدیث کی طرف تھا۔ خود سید احمد رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی عبد الحی بڈھانوی کا رجحان حنفی مکتبِ فکر کی طرف تھا، لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ لشکر میں ان فروعی مسائل یا تقلید اور ترکِ تقلید پر کبھی باہم نزاع تک نوبت پہنچی ہو۔[2]

برصغیر پاک و ہند کی تحریک جہادِ آزادی کا انجام: ہندوستان کی تحریکِ احیاء و تجدید جس کی ابتدا حضرت سید احمد سرہندی نے فرمائی اور اس کی تکمیل شاہ اسماعیل شہید، حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے فرمائی، ابتدا میں علمی اور اصلاحی تھی۔ علمائے سوء اور انگریز کے منحوس وفاق نے اسے مجبوراً سیاست میں دھکیل دیا۔ سکھوں کی حماقت نے اتقیاء کی اس جماعت کو مجبور کر دیا کہ وہ جنگ کی آگ میں کود یں اور اپنی قیمتی زندگیاں حق کی راہ میں قربان کر دیں۔ پھر گمراہ کن فتووں کی سیاہی نے ملت کے چہرے کو اس قدر بدنما کر دیا تھا کہ اسے دھونے کے لیے شہادت کے خون کے علاوہ پانی کے تمام ذخیرے بے کار ہو چکے تھے۔ وہابیت کی تہمتِ مستعار نے ذہن ماؤف کر دیے تھے۔ الحاد کی گرد اُن پر اس قدر جم چکی تھی کہ اسے صاف کرنے کے لیے صرف شہداء کا خون ہی کارآمد ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مئی ۱۸۳۱ء کی صبح کو یہ مقدس جماعت انتہائی کوشش اور ممکن تیاری کے ساتھ بالاکوٹ کے میدان میں اتری اور دوپہر سے پہلے صداقت کے نہ مٹنے والے نشان دنیا کی پیشانی پر ثبت کرنے کے بعد ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۵۴][3]

تحریک اصلاح و جہاد میں شامل دیوبند کی اہل حدیث سے علیحدگی: ۱۸۳۱ء سے پہلے یہ حضرات اہل حدیث

---

۱ نگارشات: ۲/ ۳۸۴

۲ نگارشات: ۲/ ۳۸۴

۳ نگارشات: ۳/ ۶۶-۶۷

سے قریب تھے اور حنفیت کے باوجود فقہی جمود کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ اسے کلی طور پر ختم کرنا چاہتے تھے۔ یہی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا اصلی تجدیدی کارنامہ تھا۔ ۱۸۳۱ء کے بعد ان میں اکثر حضرات تحریک توحید اور اقامت دین سے بالکل الگ ہو گئے اور اسلام کی خدمت کے لیے صرف اسی حد تک مطمئن ہو گئے جو اشاعت حنفیت اور فقہی جمود کے مرادف ہو۔ یہ لوگ شاہ صاحب کے خلفاء کے ساتھ نہ چل سکے، اس لیے کہ وہ جامد تقلید کے حامی نہ تھے۔ دیو بند کی تاسیس حنفیت خالصہ کی اشاعت کے لیے عمل میں آئی لیکن محدثین کا احترام شاہ صاحب کی تحریک سے ان کو وراثت میں ملا تھا۔ اور جو حضرات علامہ کوثری سے متاثر ہیں وہ جمود کے داعی ہیں اور ائمہ حدیث سے بغض ان حضرات کو علامہ کوثری سے وراثت میں ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حدیث کو حجت شرعی سمجھتے ہیں[1]۔

تحریک سے علیحدگی کے باوجود باہمی عناد و شقاق سے دوری: تحریک کا شعبۂ جہاد جس کی ذمہ داریاں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھیں، بے حد خطرناک تھا۔ اسے نہ سکھ برداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز۔ اس لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہ دبستان کا ایک معتدبہ حصہ صرف درس و تدریس، وعظ و خطابت اور شرک و بدعت کی تردید کی طرف راغب ہو گیا اور استخلاصِ وطن کے لیے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنے لگا اور اپنے مسلک کے موافق دیو بند، سہارنپور اور دہلی میں فقہ و حدیث کے مدارس کھول کر کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنے اپنے طریق پر مشغول ہو گئے۔ دونوں جماعتوں میں فروعی اختلاف ضرور تھا، لیکن عناد اور شقاق بالکل نہ تھا۔[2]

ولی اللہی تحریک میں شامل دیو بند اور اہل حدیث کی علیحدگی: ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کے بعد جماعت کی رہنمائی اور قیادت حضراتِ صادق پور کی طرف منتقل ہو گئی۔ مولانا ولایت علی رحمۃ اللہ علیہ صاحب صادق پوری نے جماعت کی تمام ذمے داریاں اپنے سر پر لے لیں، اس وقت سکھ فوج میں انگریز بطورِ ملازم یا رضاکار کام کر رہے تھے۔ یہ دونوں طاقتیں مجاہدین کو اپنا مخالف سمجھتی تھیں۔ سکھ کمزور ہو رہے تھے اور انگریز حکمتِ عملی سے ملک پر قابض ہو رہے تھے۔ مجاہدین بھی دونوں کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔ مولانا ولایت علی، شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ متاثر تھے، ان کے رجحانات ترکِ تقلید کی طرف تھے۔ اتباعِ سنت اور عمل بالحدیث طبیعت پر غالب تھا، اس کے بعد بالالتزام مجاہدین کی قیادت مسلسل ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی جن پر عمل بالحدیث کا شوق غالب تھا۔

---

1 نگارشات: ۲/ ۱۴۸

2 نگارشات: ۵/ ۲۱۱

آج تک جماعتِ مجاہدین پر یہی ذہن غالب ہے، لیکن فروعی مسائل کو وہاں کبھی اس قدر اہمیت نہیں دی گئی جس سے یہ مسائل محلِ نزاع قرار پائیں۔ اس کے بعد پوری جماعت میں فقہ العراق کا رجحان کم ہوتا گیا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت اکابرِ احناف تحریک سے دستکش ہو گئے اور جو لوگ جماعت سے تعلق رکھتے تھے، وہ بھی پھر پچھلی صفوں میں چلے گئے۔ بظاہر حنفی مکتبِ فکر کا جماعت کے ساتھ نمایاں تعلق نہ رہا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ علاحدگی فقہی رجحانات کی وجہ سے تھی یا اس وقت انگریز کے ظالمانہ تشدد کی وجہ سے۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء کے معرکۂ حریت تک اور اس کے بعد آج تک جماعتِ مجاہدین کا نظام ساداتِ صادق پور اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ حنفی مکتبِ فکر کے لوگ نمایاں طور پر سامنے نہیں آئے۔ ۱۸۵۷ء کا معرکہ انگریز کمپنی کی ظالمانہ بداعمالیوں کا قدرتی نتیجہ تھا۔ یہ تحریک پورے ملک کی تحریک تھی، اسے احناف یا اہل حدیث سے کوئی خاص نسبت نہ تھی، اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل تھے، بلکہ خیر آبادی خاندان نے اپنی پرانی غلطی کو محسوس کیا جو وہ اپنے اساتذہ اور اُن کے خاندان کے خلاف اس سے پہلے کر چکے تھے۔ مولانا خیر آبادی نے اس وقت اس ہنگامے کو جہاد قرار دیا اور انگریز کے خلاف لڑنے کا فتویٰ دیا جس کی پاداش میں انھیں عبورِ دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس تحریک میں مجاہدین نے بھی کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ مولوی رحمت اللہ اس وقت دہلی تشریف لائے جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دم توڑ رہا تھا۔ بہادر شاہ صورتِ حالات سے مایوس تھے۔ ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ حجاز چلے گئے۔ مجاہدین کا ساتھ وہ اس لیے نہیں دینا چاہتے تھے کہ تحریک کی قیادت اہل حدیث کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ حاجی امداد اللہ صاحب کا رجحان بریلویت کی طرف تھا، لیکن طریقت میں وہ حضراتِ دیوبند کے شیخ طریقت تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے "آبِ حیات" میں ان کا تذکرہ بڑے احترام سے فرمایا، بلکہ "آبِ حیات" کی اشاعت حاجی صاحب کے ایما سے ہوئی۔ اس سفر میں "آبِ حیات" مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بد نظمی آگئی تھی اور اس کا مطمح نظر اقامتِ دین نہیں تھا، بلکہ قومی آزادی اور نیشنل قسم کی حکومت اس ہنگامے میں پیشِ نظر تھی۔ اس لیے مجاہدین نے بھی اس میں نمایاں حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ اپنی تحریک کو اپنے طے شدہ نظم کے مطابق چلاتے رہے۔ انگریز روز بہ روز پنجاب کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے سامنے ان اہل توحید مجاہدین کے سوا کوئی منظم تحریک نہ تھی، اس لیے انگریز کی مخالفت اور سخت ہو گئی۔ اس نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ اور لڑائی کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر حضرت مولانا محمد قاسم نے مدرسہ دیوبند کی تاسیس فرمائی اور اپنے مسلک کی علمی خدمت پوری مستعدی سے شروع فرما دی۔ دیوبند، سہارنپور، میرٹھ وغیرہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ درسِ نظامی کی تعلیم اور

حنفی مسلک کی اعانت کے لیے پورے انہماک سے کام شروع کیا گیا۔ ان بزرگوں کی ان مخلصانہ کوششوں کے ساتھ تحریکِ جہاد کی اعانت اور سرپرستی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ یہ ساری ذمے داری اس وقت پٹنہ کے صادق پوری حضرات ہی اٹھائے ہوئے تھے[1]۔

علمائے دیوبند کی تحریک جہاد آزادی سے کلی طور دست برداری: جہاں تک سیاسی نظریات کا تعلق تھا، اکابرِ دیوبند مئی ۱۸۳۱ء کے بعد تحریکِ جہاد سے تقریباً دست کش ہوگئے، پھر وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد تقریباً ۱۹۱۸ء میں تحریکِ خلافت کے ساتھ پھر سیاست میں آئے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ترکی کے ساتھ تعلقات جوڑنے کی کوشش کی، لیکن ترکی ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ اس نے قبائے خلافت ہی اتار کر پھینک دی، اس کا اثر پوری دنیا کی اسلامی سیاسیات پر پڑا۔ ہندوستان کی مجلسِ خلافت بھی تقریباً بے جان ہو کر رہ گئی۔ اس کی جگہ بتدریج کانگریس، مجلسِ احرار وغیرہ نے لے لی۔ اہلِ حدیث پر انگریز کی مخالفت کا جنون اس طرح سوار تھا کہ وہ قلتِ عدد کے باوجود ہر محاذ پر لڑتے رہے۔ کانگریس، مجلسِ احرار، مجلسِ خلافت اور مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں میں اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہے۔ کبھی اہلِ حدیث، غیر اہلِ حدیث کا خیال ذہن میں نہیں آنے دیا۔ انگریز کی مخالفت ان کے مزاج میں سمو دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی تحریکِ جہاد کے ساتھ ان کا پورا پورا تعاون تھا۔ مولانا عبد القادر مرحوم قصوری، مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبد الاول غزنوی مرحوم، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی مرحوم، مولانا ولی محمد فتوحی والا مرحوم اور اکبر شاہ سخانہ مرحوم سیاسی تحریکات کے شباب میں بھی سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید کی امانت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔ انہی ایام میں مرحوم مولانا محمد علی قصوری اسلامیہ کالج کے چند نوجوانوں کے ساتھ سرحد سے پار نکل گئے۔ مجاہدین سے ملے اور کابل وغیرہ کی خاک چھانتے پھرے۔ رحمهم الله وتقبل أعمالهم[2]۔

تحریک جہاد آزادی کے اہل حدیث زعماء: سانحہ بالاکوٹ میں سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید ہوگئے۔ تحریک میں قیادت مولانا ولایت علی فرمانے لگے۔ اس اثنا میں سکھوں اور انگریزوں میں تصادم ہوا۔ سکھ حکومت آخری ہچکیاں لے کر ختم ہوگئی لیکن سرحد پر انگریزوں سے ۱۹۲۱ء تک تصادم ہوتا رہا جس میں مجاہدین بدستور

---

۱ نگارشات: ۲/ ۳۸۵-۳۸۷

۲ نگارشات: ۲/ ۳۸۹-۳۹۰

گوریلا جنگ لڑتے رہے۔ بریلویوں اور شیعہ کے سوا تمام مسلمان اس تحریک کی مالی سرپرستی کرتے رہے۔ کشمیر کی جنگ میں ان مجاہدین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی قیادت مرحوم لیاقت علی خاں کے مشورے سے مولانا فضل الٰہی فرماتے رہے۔ سکھوں کے بعد آخر پنجاب پر انگریزوں کے سوا کون قابض تھا جس سے پوری صدی تک شمال مغربی سرحد پر تصادم ہوتے رہے؟[1]

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے مخالفین: تین گروہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی جو حسبِ ذیل ہیں

① روافض: کیوں کہ یہ زمانۂ قدیم ہی سے ائمۂ اہلِ سنت کے مخالف رہے ہیں اور صفات وغیرہ میں مسلکِ اعتزال کی طرف عمومی رجحان رکھتے ہیں، ان کے ائمہ ان کے نزدیک حقیقت میں انبیاء ہیں۔ نیز ان کے تمام اعمال اہل سنت اور اہل حدیث کے خلاف ہیں۔

② ہندوستان میں بدعت کے علمبردار اور قبر پرست مشرک، ان کا دین عوام ہے۔ عوام جو گناہ اور برے اعمال کرتے ہیں، ان کا کام ان کے لیے کتاب و سنت سے دلائل تراشنا ہے۔

③ فقہائے عراق کی طرف نسبت رکھنے والے احناف، یہ توحید میں ہمارے شریک ہیں، اس کے باوجود وہابیت سے خوف کھاتے ہیں اور تقلید و جمود کی دعوت دیتے ہیں، کیوں کہ لفظِ وہابی عرفِ عام میں امام محمد بن عبد الوہاب نجدی سے علم و خیر کا استفادہ کرنے والے ہمارے نجدی بھائیوں اور ہندوستان کے اہلِ حدیث کے درمیان مشترک ہے، جو اس تحریک کے امام اور داعی شاہ اسماعیل شہید بن شاہ عبد الغنی بن شاہ ولی اللہ محدث سلفی کے توسط سے اس نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔ یہ عظیم فقہاء، فرزندانِ دیوبند وہابیت سے خوف کھاتے ہیں، یہ لفظ سن کر ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور امام محمد بن عبد الوہاب کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر کروڑوں رحمتیں برسائے[2]۔

تحریک اہل حدیث میدان جہاد سے درس و تدریس کی مسند تک: ۱۸۵۷ء کی تحریک نے صاحب بہادر کے مزاج کو اتنا برہم کر دیا تھا، وہ حضراتِ شیعہ اور بریلوی بزرگوں کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں پہلے مقصد کے لیے کوشش کرنا موت کی بازی لگانے کے مرادف تھا۔ علمائے حق کے لیے یہ سودا بھی چنداں گراں نہ تھا۔ وہ بڑی خوشی سے اس کے لیے ایک دفعہ سر دھڑ کی بازی لگا دیتے، لیکن سر سید احمد خاں

---

۱ نگارشات: ۲/ ۲۷۹

۲ نگارشات: ۵/ ۱۵۴-۱۵۵

صاحب نے اس وقت ایک بالکل جدا پروگرام ملک کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے انگریز سے تعاون اور انگریزی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے کالج کی بنیاد رکھ دی، اسی پروگرام نے ملک میں طوفان کی صورت اختیار کرلی۔ ۵۷ء کی قربانیوں اور جانبازیوں سے تھکے ہوئے قدرتی طور پر آرام اور کچھ سستانے کے خواہش مند تھے۔ سرسید کے پروگرام میں یہ دونوں مطلب ہی نہیں، بلکہ بہ ظاہر نیند (اور دراصل موت کا سامان) موجود تھا۔ ایسے وقت میں علماء کی کون سنتا تھا اور اہل حق کی وقعت کہاں تک ہو سکتی تھی، جب کہ ان کا راستہ پرخار تھا اور مہالک سے معمور بھی۔ سرسید کی راہ میں بہ ظاہر آرام تھا۔ شکم پروری کی امید تھی۔ انجام کچھ بھی ہو، مگر بہ ظاہر اس میں کوئی خطرہ نہ تھا۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ: اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہ ظاہر پہلا پروگرام ترک کر دیا گیا۔ دینی مدارس کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت میاں صاحب مرحوم نے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھی جو دریا کی سطح سے بھی زیادہ ہموار تھا۔ اگر شریر طاقتیں حکومت کے تعاون سے ایک متوازی نظام کھڑا نہ کر دیتیں تو تعجب نہ تھا کہ یہ مدارس دونوں مقاصد کے کفیل ہوتے۔ تاہم حضرت شیخ الکل نے دینی انقلاب کے لیے ایسی زمین تیار فرمائی جس کی نظیر کم ملے گی۔ زہد و تقویٰ میں حضرت عبد اللہ غزنوی اور حضرت الفقیہ الزاہد مولانا عبد الجبار غزنوی کی تربیت فرمائی۔ اربابِ قلم میں مولانا محمد حسین بٹالوی اور بقیۃ السلف مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی اور حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری ایسے خلف الصدق مغفور کی بہترین یادگار ہیں، اور مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی اور حضرت الاستاد مولانا حافظ عبد المنان صاحب وزیر آبادی۔ برد اللہ مضجعہما۔ ایسے اصحابِ التدریس کا نام لیا جاسکتا ہے، اور حضرت مولانا امام عبد العزیز صاحب رحیم آبادی اور حضرت حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری ایسے مجاہدین بھی اسی درس کی پیداوار تھے[1]۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک جہاد اسلامی و آزادی ہند کی مخالفت: یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ رضاخوانی حضرات مولوی احمد رضا خان صاحب کی قیادت میں ہمیشہ انگریز بہادر کی کاسہ لیسی فرماتے رہے اور تحریک جہادِ اسلامی و آزادیِ ہند کی ہر ممکن مخالفت کی۔ انگریزی ہند کی دار الاسلامیت پر کتابیں لکھتے رہے۔ ترکوں کے خلاف انگریزی فوجوں کو تعویذ بھی مہیا کرتے رہے۔ جبکہ اہل توحید نے اس کے پورے دورِ اقتدار میں نہ صرف ملک کی سرحدوں پر انگریز سے لڑائیاں لڑیں بلکہ اندرونِ ہند بھی ہر قسم کی آزادی کی تحریک چلا

1 نگارشات: ۴/ ۳۷۹

کریا ان میں شامل ہو کر اس کو پریشان کیے رکھا تا آنکہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اہلِ توحید کا یہ ایسا اعلیٰ کردار ہے جس پر انگریز دنگ تھا، ہندو حیران اور سب مسلمان ممنون![1]

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے علمی گدی نشین شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی (م ۱۳۲۰ھ): اس دور کے دو بزرگ ہیں جنھیں خدمتِ سنت اور طریقہ سلف کے احیا میں بلند ترین مقام حاصل ہے، حضرت نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم بھوپال اور شیخ الکل نذیر حسین صاحب دہلوی۔ نواب صاحب ریاست میں با اختیار مقام کے باوجود تصنیف و تالیف اور دینی مشاغل کی طرف راغب تھے اور تقلید و جمود کے خلاف ان کے قلم نے اتنا کام کیا جو شاید کوئی جماعت بھی مشکل سے کر سکے۔ مرحوم کی تصانیف مختلف فنون میں سیکڑوں تک پہنچی ہیں۔ حضرت میاں صاحب کے پاس اللہ پر توکل اور مسجد کی چٹائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میاں صاحب مولانا اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے ساتھ والہانہ عقیدت تھی۔ علومِ آلیہ اور عالیہ میں پوری مہارت تھی۔ جامع العلوم تھے۔ مزاج میں تواضع اور انکسار تھا۔ تملق اور لجاجت نام کے لیے طبیعت میں موجود نہ تھا۔ لالچ اور طمع ایسے امراض سے ذہن بالکل صاف تھا۔ فنِ حدیث کی اشاعت اور مسلکِ سلف کی خدمت کو زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ مشاہرات کا نہ یہ دور تھا نہ طبیعت میں اس کے لیے کوئی مقام۔ زمانے کے اتفاقات سمجھیے کہ حضرت شاہ اسحاق کی ہجرت کے بعد اسی مسند پر دین کی خدمت کا موقع میسر آیا۔ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقلیدِ مروج اور جمود کے خلاف جرات مندانہ قدم اٹھایا تھا، لیکن جہاد کی مشغولیت اور اس کے مصالحوں کے تقاضوں کی بنا پر اس کی تکمیل نہیں فرما سکے تھے۔ میاں صاحب نے اسے مقصدِ حیات قرار دیا اور تمام مشاغل سے فی الجملہ الگ ہو کر اس میں مشغول ہو گئے اور پوری عمر اس میں صرف فرما دی۔ پوری عمر نہ نقل مکانی کی ضرورت محسوس کی اور نہ کسی خوف و ہراس نے پروگرام کی تبدیلی پر مجبور کیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب ایسی ہیبت ناک صورت نے بھی میاں صاحب پر کوئی اثر نہ کیا۔ شہر پر توپیں آتش باری کر رہی تھیں، ادھر مسندِ درس گرم تھی۔ اسباق شروع تھے، طلبہ خائف تھے، لیکن حضرت میاں صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بدستور تدریس کے سلسلے میں تشریف لاتے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب بالکل بے قاعدہ تھا۔ انگریزوں کی بد کرداریوں کے سبب تقریباً پورے ملک میں پھیلا، لیکن بد نظمی کی وجہ سے ناکامی پر منتج ہوا۔ میاں صاحب نے اس میں انگریز عورت کو باغیوں سے بچایا اور اسے پناہ دی۔ یہ بالکل اسلامی تعلیمات کے

---

۱ نگارشات: ۲/ ۲۷۶

مطابق تھا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا شرعاً درست نہ تھا۔ باغی اور آوارہ مزاج لوگوں نے اسی بہانے سے میاں صاحب کے مکان پر حملہ کیا اور ایذاء پہنچائی، اس کی اطلاع رضی الدولہ بہادر میرزا قدرت اللہ بیگ نے بہادر شاہ ظفر شاہِ دہلی کو دی۔ بادشاہ نے شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہنگامے کو فرو کروائیں اور میاں صاحب سے دعا کے لیے عرض کریں، کیوں کہ ہمارے بزرگ مشکلات میں اہل اللہ سے دعا کرایا کرتے تھے۔ (روزنامچہ ۱۸۵۷ء مولفہ عبداللطیف[1])

حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کا اثر: میاں صاحب کے تلامذہ کے مزاج اور طریقۂ کار میں عجیب تنوع معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق مرحوم سے اثر لیا۔ مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، حاجی علی جان رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان، انگریز کے سخت مخالف تحریکِ مجاہدین کے حامی بنے اور تحریکِ مجاہدین جب ۱۸۳۱ء کے بعد زیرِ زمین چلی گئی تو ان حضرات کی مخلصانہ مساعی سے تحریک زندہ رہی اور ۱۹۴۷ء تک انگریز کے لیے وبالِ جان بنی رہی۔ پنجاب میں مولانا عبدالقادر قصوری وکیل، مولانا عبدالاول غزنوی، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا ولی محمد فتوحی والے، مولانا اکبر شاہ سُخانہ اس تحریک کے سرگرم رکن اور موید تھے۔ وللتفصيل موضع آخر۔ ایک جماعت کا رجحان تدریس کی طرف تھا، جن میں مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی، مولانا عبدالمنان صاحب وزیر آبادی، مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی اور مولانا عبدالقادر صاحب لکھوی رحمہم اللہ علیہم- وَسِوَاهُمْ خَلْقٌ لَا يُحْصُوْنَ۔ بعض کا رجحان تصنیف و تالیف کی طرف تھا، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی، مولانا عبدالرحمان صاحب مبارک پوری، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا حافظ محمد صاحب لکھوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولانا احمد غزنوی رحمة الله عليهم أجمعين۔ بعض کا رجحان مناظرانہ تھا، مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی، مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا عبدالحکیم صاحب نصیر آبادی وغیرہم رحمہم اللہ علیہم۔ بعض وعظ و تقریر میں نابغۂ دوراں تھے، مولانا محمد علی بوپڑہ، مولانا محمد صاحب لکھوی اور مولانا عبدالوہاب ملتانی دہلوی وغیرہم رحمہم اللہ علیہم[2]۔

حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی امن پسندی: میاں صاحب کا ذہن قطعاً تفریق پسند نہ تھا۔

---

۱ نگارشات:۵/ ۱۷۱-۱۷۲

۲ نگارشات:۵/ ۱۷۳

دہلی شہر میں رہتے ہوئے اور تلامذہ کے حلقے میں بے حد وسعت کے باوجود میاں صاحب نے الگ جمعہ قائم نہیں فرمایا، بلکہ مدت العمر شاہی مسجد کے حنفی امام کے پیچھے نمازِ جمعہ ادا فرماتے رہے۔ مغل دربار تک تعارف اور شناسائی کے باوجود جمعہ علاحدہ کرنا پسند نہ فرمایا۔ حضرت میاں صاحب کے انتقال کے بعد احناف کے تشدد اور عصبیت کی وجہ سے دہلی میں اہلِ حدیث اور احناف کے متعدد جمعے قائم ہوگئے[1]۔

مخالف علماء کی ریشہ دوانیوں پر حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تحمل: ۱۳۰۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۸۳ء میاں صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اتفاقاً مولوی رحمت اللہ کیرانوی مرحوم اور حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم اور مولانا خیر الدین صاحب مرحوم پہلے وہاں موجود تھے۔ کچھ اور علمائے کرام ہندوستان سے صرف اس لیے حجاز پہنچے کہ میاں صاحب کو وہاں گرفتار کروادیں، اور رسالہ "جامع الشواہد" کا عربی ترجمہ کرکے ترکی کے گورنر کے سامنے پیش کیا، حالاں کہ وہ ان حضرات نے ہی یہاں شائع کروایا تھا۔ تعجب ہوتا ہے مذہبی تعصب کتنے بڑے بڑے اعاظمِ رجال کو ایسے کبائر پر آمادہ کرلیتا ہے، وہ ان غلط بیانیوں میں نہ اپنے مقام کو سوچتے ہیں اور نہ مستقبل کی بدنامی سے گھبراتے ہیں۔ اس کی تفصیل مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے "اشاعة السنة" (جلد نمبر ۶، ص: ۱۰، ۱۱) میں دی ہے اور "الحياة بعد المماة" (ص: ۴۰۸) میں بھی موجود ہے۔ گورنرِ ترکی کو جب حقیقتِ حال کا علم ہوا تو میاں صاحب کو باعزت بری کرکے اپنی نگرانی میں مدینہ منورہ بھیجا، ان حضرات کو سخت تنبیہ کی، لیکن میاں صاحب مرحوم نے اس کے متعلق کوئی انتقامی کارروائی نہ وہاں کی اور نہ واپس دہلی آکر کسی رنج کا اظہار فرمایا، بلکہ صفحِ جمیل پر عمل فرمایا، حالاں کہ یہاں پہنچ کر انتقامی طور پر بہت کچھ کیا جاسکتا تھا، لیکن اس خیرِ مجسم نے کسی انتقامی کارروائی کے لیے آمادگی کا اظہار نہ فرمایا[2]۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ: حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فنِ تصوف و زہد کے بہترین ماہر مشہور تھے، لیکن حقیقتِ زہد کو خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں تک ان میں موجود تھا۔ ہاں اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سچے صوفی سنت کے شیدا ہوتے ہیں، مگر حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی تصانیف میں سنت اور اصحابِ حدیث سے انتہائی بغض پایا جاتا ہے۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُ[3]۔

---

۱ نگارشات: ۵/ ۱۷۵

۲ نگارشات: ۵/ ۱۷۶-۱۷۷

۳ نگارشات: ۵/ ۱۹۸

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب اور اس کی تعبیر: اسی غلط تصوف کی وجہ سے ان کی طبیعت پر وہم غالب تھا اور یہ چھاچھ والا خواب اور اس کی تعبیر اسی وہم کا کرشمہ ہے۔ ورنہ چھاچھ پینے کے بغیر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس میں روغن نہیں؟ ہر چھاچھ تو ایسی نہیں، جس میں روغن نہ ہو، (کیوں کہ دہی کی چھاچھ بھی تو آخر چھاچھ ہی کہلاتی ہے۔ کیا اس میں روغن نہیں ہوتا؟) خدا تعالیٰ مرحوم کو معاف فرمائے۔ خواب کی تعبیر میں انہوں نے حضرت میاں صاحب پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ [الشعراء:۲۲۷][1]

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کی بنیادی فکر: حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محمد طاہر پٹنوی کی مساعی کو اگر اجمالی سمجھا جائے تو شاہ صاحب سے اس کی تفصیل کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ حجۃ اللہ البالغہ، انصاف اور عقد الجید کے پڑھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ دعوت کسی فرقے یا گروہ کے لیے نہ تھی۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ایسے فرعی اور فقہی گروہوں میں سے بھی شاہ صاحب کے دل میں کسی کے لیے عصبیت نہیں۔ وہ مسائل میں صرف دلائل کی بنا پر گفتگو فرماتے ہیں۔ اصولِ فقہ تک، شاہ صاحب کی تنقید سے نہیں بچ سکے۔ صاحبِ ہدایہ اور علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ شاہ صاحب کی نگاہِ تنقید سے نہیں نکل سکے۔ اس لیے جہاں تک میرا ناقص علم میری راہ نمائی کرتا ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اہلِ حدیث کوئی فرقہ نہیں، بلکہ اسلام کی وہ صحیح تعبیر ہے جسے طریقۂ سلف یا مسلکِ صحابہ کے مرادف سمجھنا چاہیے۔ اہلِ حدیث مبلغین کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔ اگر وہ اسے فرقے کا رنگ دیں گے تو وہ اپنے مخالفین کی نادانستہ حمایت کریں گے[2]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کی نوعیت: حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہم نے کوئی اصطلاحی تحریک نہیں چلائی، جس کے بزرگ صدر یا سربراہ ہوں، اس کی مجالس کا جال ملک میں پھیلا ہو، جس کے ممبر اور اعوان و انصار کسی عرفی تنظیم کے ماتحت کام کر رہے ہوں۔ بلکہ ان میں ہر ایک اپنے وقت میں ایک مینار ہے جس سے خود بخود روشنی پھیلتی ہے۔ لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ کسی عہدے اور عرفی نظم کے بغیر ان تاثرات کو پھیلایا جاتا ہے اور وہ اس سرعت سے پھیلتے ہیں کہ کوئی عرفی تحریک اس کی

---

۱ نگارشات:۵/ ۱۹۸

۲ نگارشات:۴/ ۳۴۴

مثال پیش نہیں کر سکتی[1]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث اور نجد کی وہابی تحریک میں فرق: اس حقیقت میں بھی شبہہ نہیں کہ ہندوستان کی تحریک توحید نجد کی تحریک کا تتمہ یا ضمیمہ نہیں... غرض وہابی تحریک میں ہزار خوبیاں ہوں، ہندوستان کی تحریک اس سے الگ اور ایک مستقل تحریک ہے۔ اس میں دینی اصلاح کے ساتھ سیاسی سربلندی لازمی جزو ہے[2]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے مقاصد ثلاثہ: تحریکِ اہل حدیث کی موجودہ رفتار کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور اربابِ بست و کشاد اسے تبلیغ کے ریشمی رومالوں میں لپیٹنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، تاریخ کی لازوال شہادت اسے چھپنے نہیں دے گی کہ مغل حکومت کی تباہی یا تبدیلی کے بعد اربابِ فکر اور جماعت کے مقتدر اصحابِ نظر کے سامنے دو مقصد تھے:

① مغلوں کے فرسودہ اور لادینی نظام کی جگہ ہندوستان میں ایسا نظامِ حکومت قائم کرنا جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو۔ اس مقصد کے لیے "حجۃ اللہ البالغۃ" اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں شرعی نظام کے مصالح اور حکمتوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے۔

② دوسرا مقصد بدعت، تشیع اور نفاق کی مخالفت تھا۔ اکبر کی مداہنت اور شاہجہان اور دارا شکوہ کی بے عملی اور لاعلمی نے بدعتِ رفض کے لیے بہت حد تک میدان ہموار کر دیا تھا۔ یہ سرقہ اور عیاری اہل سنت کے اربابِ فکر سے مخفی نہ تھی۔ اس لیے ہندوستان کی تحریکِ توحید کا دوسرا مقصد رفض اور اس کی منافقانہ سازشوں کی نشان دہی قرار پایا۔ "تحفہ اثنا عشریہ" اور "إزالۃ الخفاء" ایسی مایہ ناز تصانیف اسی مقصد کی تکمیل کے لیے بطورِ ذریعہ اہل علم کے سامنے ہیں[3]۔

(متحدہ) ہندوستان میں اس تحریک کے مویدین کے سامنے تین مقصد تھے؛

① آزادیٔ فکر، تقلید و جمود سے بچ کر کتاب و سنت سے براہِ راست اصول و فروعِ دینیہ کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان تالوں کو توڑ دینا جو اس موہبۂ الٰہی کے دروازوں پر لگائے گئے تھے جسے عقل و دانش سے تعبیر

---

۱ نگارشات: ۲/ ۱۱۰

۲ نگارشات: ۴/ ۳۴۷

۳ نگارشات: ۴/ ۳۷۸

کیا جاتا ہے۔

(۲) بدعات و محدثات کی مخالفت کرنا اور اسلام کی اس سادہ صورت کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا جو قرونِ اولیٰ میں موجود تھی اور جس پر سلفِ اول نے عمل کرکے کامیابی حاصل کی تھی۔

(۳) دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا اور سیاست کے رخ کو اس طرح بدل دینا کہ اسلامی نظام قائم ہو، کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے دنیا کے مختلف مذاہب صحیح امن و چین اور مذہبی آزادی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں[1]۔

برصغیر کی تحریک اہل حدیث کے اسباب و محرکات: ہمارے لیے یہ بات جاننا مشکل ہے کہ اس نشأۃِ ثانیہ کی تحریک کے تدریجی ارتقا کے پیچھے کوئی ٹھوس فکر اور مضبوط شوریٰ تھی یا بغیر کسی سابقہ فکر کے یہ ایک محض اتفاقی حادثہ تھا لیکن ایک صاحبِ عقل اس بات میں شک نہیں کرسکتا کہ جو بھی ہوا ایک ٹھوس، مستحکم، دانشمندانہ منہج اور اساس کے مطابق تھا۔ پہلے نے جو بات نرم اور آسان انداز میں کہی وہی بات دوسرے نے اسی پر بنیاد رکھ کر کہی۔ اس کی مثال عملی فروع میں اختلافی مسائل کی ہے، جیسے چار جگہوں میں رفع الیدین کرنا، بلند آواز سے آمین کہنا، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قراءت کرنا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان مسائل میں اپنی محققانہ اور مفتیانہ رائے دی ہے، ان کے بیٹے شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تلقین کرتے ہوئے اس کی صراحت کی ہے، جبکہ شہید برحق شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے منبروں پر، مجلسوں میں اور جلسہ گاہوں میں بے لاگ انداز میں کھلے عام اس کا اظہار کیا ہے[2]۔

تحریک اہل حدیث کے اکابر علماء کے کام کی قدرتی تقسیم کار: میری معلومات کے مطابق اکابر جماعت اتفاقاً ایسی راہ پر چل پڑے جسے تقسیم کار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا عبد الجبار صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبد المنان صاحب، حضرت مولانا عبد القادر صاحب (پشاور)، حضرت مولانا عبد الجبار صاحب عمر پوری، مولانا محمد بشیر صاحب سہسوانی، مولانا حافظ عبد اللہ غازی پوری، حضرت مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی تعلیم کے میدان میں آگئے۔ قلتِ وسائل کے باوجود ان حضرات نے اتنا کام کیا جس پر حیرت ہوتی ہے۔ ہر طرح دنیوی وسائل سے بے نیاز ہو کر ان بزرگوں نے

---

۱ نگارشات: ۵/ ۲۰۹

۲ نگارشات: ۵/ ۱۲۵-۱۲۶

تدریسی خدمات انجام دیں...

تصنیف و تالیف: حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خاں صاحبؒ، مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی، مولانا ابوالحسن سیالکوٹی (صاحب فیض الباری شرح اردو صحیح بخاری)، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا تلطف حسین صاحب عظیم آبادی، نواب وحید الزمان مرحوم، مولانا عبدالرحمان صاحب مبارکپوری، حضرت مولانا غلام حسن سیالکوٹی، مولانا محمد غزنوی، مولانا عبدالاول غزنوی، مولانا عبدالغفور غزنوی، شیخ محی الدین مرحوم، قاضی سلیمان صاحب پٹیالوی، مولانا حافظ محمد لکھوی، مولانا محمد حسین بٹالوی نے تالیف و تصنیف اور طبع و اشاعت کا کام سنبھال لیا اور لاکھوں صفحات پر پھیلا ہوا لٹریچر شائع کر دیا۔ ان حضرات کی مساعی سے بہت بڑا خلا پُر ہو گیا۔ حدیث، شروح و تراجمِ حدیث اور سلفی مکتب فکر کی بہت کتب ہندوستان میں آ گئیں۔

جہادِ اسلامی: مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا سعید الحق، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، حضرت مولانا عبد القادر قصوری، حضرت مولانا عبد الأول غزنوی، امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا عبد الرحیم عرف مولانا محمد بشیر، مولانا اکبر شاہ سخانوی، صوفی ولی محمد فتوحی والا، صادق پوری حضرات نے سید شہید کے مشن کو کامیاب بنانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی اور اس نظم سے کام کیا کہ پون صدی تک انگریز کو پریشان کر دیا۔ کوہستان کی برفانی پہاڑیاں انگریز کے لیے جہنم سے کم نہ تھیں[1]۔

علمائے اہل حدیث کا انگریز کے خلاف کانگرس سے اشتراک: کانگرس بھی اس وقت آج کی کانگرس نہ تھی، نہ انگریز کے ساتھ لڑنا اس کے پروگرام کا لازمی جزو تھا مگر جب وہ انگریز کی مخالفت کے لیے مستعد ہوئی تو اہل حدیث نے اس میں ہر ممکن اشتراک کیا۔ مولانا ابوالقاسم بنارسی مرحوم، مولانا عبدالوہاب صاحب آروی، حاجی محمد صالح صاحب کوٹھی علی جان، مولانا عبدالقادر صاحب قصوری، مولانا سید محمد داود صاحب غزنوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب غزنوی، مولانا سید عبد الغفار صاحب غزنوی، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب مرحوم، خود راقم الحروف نے اپنی بساط کے مطابق سالہا سال کانگریس میں کام کیا[2]۔

اہل حدیث کی تحریک مزاحمت و مقاومت: اہل حدیث کی ہندوستانی نشأت میں انگریز کی مخالفت ان کی تحریک کا جزو تھا، اس لیے اس کے علاوہ جو تحریک اس بنیاد پر اٹھی یا جب وہ اس مقام پر پہنچی اہل حدیث اپنی

---

۱ نگارشات: ۲/ ۲۶۷-۲۶۸

۲ نگارشات: ۲/ ۲۷۱-۲۷۲

پوری قوت کے ساتھ اس میں موجود تھے۔ کانگریس، خلافت، احرار کون سی قومی یا دینی تحریک تھی جس میں اہل حدیث نے جاں نثارانہ کام نہیں کیا؟ آپ کے دوش بدوش نہیں تھے؟ دہلی میں حاجی علی جان کی کوٹھی کیا ان سیاسی دیوانوں کا مرکز نہ تھی؟ پنجاب میں سیدی العالم مولانا عبد القادر قصوری کی قیادت میں کیا کانگریس اور خلافت کا کام نہیں ہوا؟ مولانا محمد علی قصوری مرحوم کی تبلیغی اور سیاسی مساعی نظر انداز کرنا کہاں تک ممکن ہے؟ احرار کے اسٹیج پر مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولوی عبید اللہ احرار فیروز پوری، شیخ عبد الرشید صدیقی ایسے مخلص کارکنوں کو کوئی بھول سکتا ہے؟[1]

تحریک مزاحمت و مقاومت سے مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ کا استثناء: اہل حدیث کی طرف سے انگریز کی حمایت میں اگر کوئی قابلِ ذکر آواز تھی تو وہ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم بٹالوی تھے۔ یقیناً مولانا اس رائے میں اکیلے تھے۔ یہ ان کی شخصی رائے تھی۔ پورے ملک میں کوئی قابلِ ذکر اہل حدیث اس نظریے میں ان کے ساتھ نہ تھا بلکہ عین اس وقت جب مولانا اپنے رسالے میں انگریز کی حمایت فرما رہے تھے، ہندوستان اور پنجاب میں اکابر جماعت سید احمد شہید کی تحریک کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل تھے۔ کیا کسی غزنوی اور لکھوی خاندان یا صادق پوری اور رحیم آبادی اور قصوری اکابر نے مولانا بٹالوی کی کبھی حمایت فرمائی؟ اسے جماعتی فعل تصور کرنا واقعات پر ظلم ہے[2]۔

تحریک کے قائدین کی تقسیم کار جماعت کا اجتماعی فیصلہ نہیں تھا: تحریک مجاہدین کو جن ناخوشگوار حالات سے سابقہ پڑا، انگریز کے انتقامی جذبوں نے اسے جس طرح کمزور کیا، اس کے نتائج میں انتشار رونما ہوا۔ مولانا بٹالوی کی طرح بعض نے انگریز کے ساتھ سمجھوتہ اور سازگار حالات پیدا کرنا مناسب سمجھا۔ بعض اپنی روش پر قائم رہے۔ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں چلے گئے۔ بعض خاموش ہو گئے۔ بعض نے تعلیم کا رخ کیا۔ بعض تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ حالات کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسے جماعتی فیصلہ نہیں کہنا چاہیے[3]۔

(جاری ہے)

---

۱ نگارشات: ۲/ ۲۶۸-۲۶۹

۲ نگارشات: ۲/ ۲۶۹-۲۷۰

۳ نگارشات: ۲/ ۲۷۵

اقتضاء الصراط المستقیم

ملت، تہذیبی امتیاز اور ایک اہم اردو استفادہ

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ | حافظ طاہر اسلام عسکری

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م۷۲۸ھ) کی معروف تصنیف اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفة أصحاب الجحیم عموماً تشبہ بالکفار، غیر مسلموں کے تہواروں اور بعض ظاہری رسوم کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ مباحث کتاب میں یقیناً نمایاں ہیں مگر اس کا دائرہ ان سے کہیں وسیع ہے۔ خود تالیف کا پس منظر بتاتا ہے کہ بات ابتدا میں غیر مسلموں کے تہواروں اور بعض مخصوص ظاہری موافقتوں سے اٹھی لیکن حافظ ابن تیمیہؒ نے جلد محسوس کیا کہ یہ کسی ایک فقہی جزئیے کا نہیں، شریعت کے ایک بڑے اصول کا مسئلہ ہے۔ چناں چہ بحث ملت، صراطِ مستقیم، ظاہر و باطن، شعار، موافقت و مخالفت اور دینی امتیاز کے ایک جامع تصور تک پھیل گئی۔ یہی اصول آگے چل کر زبان، عادات، اعیاد، معاشرت اور غیر مسلموں کے ساتھ عملی تعامل کی متعدد صورتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اردو میں 'اقتضاء' سے استفادے کی کوششیں اس سے پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ عبد الرزاق ملیح آبادی کا کام ایک عرصے تک اس کتاب کا اہم اردو تعارف رہا؛ مولوی شمس تبریز خان نے **"اسلام اور غیر اسلامی تہذیب"** کے عنوان سے اسے پیش کیا؛ جب کہ ڈاکٹر عبد الرحمن الفریوائی کی عربی تلخیص کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے قلم سے **"راہِ حق کے تقاضے"** کے نام سے شایع ہوا۔ حامد کمال الدین کے نزدیک، ان خدمات کی اپنی قدر کے باوجود، کتاب کا وہ اصولی ڈھانچا پوری قوت کے ساتھ سامنے نہیں آ سکا جسے وہ **"ملتوں کا فرق"** کہتے ہیں۔ خصوصاً ابتدائی اور بنیادی مباحث کے حذف یا اختصار سے یہ تاثر پیدا ہونے کی گنجایش رہی کہ 'اقتضاء' زیادہ تر بدعات، رسوم، میلوں اور تہواروں کے احکام کی کتاب ہے جبکہ مترجم کی نگاہ میں اس کا اصل مقدمہ اس سے کہیں گہرا ہے۔ اسی خلا کو پُر کرنے کی خواہش سے موجودہ **"اردو استفادہ"** وجود میں آیا۔

مترجم کا منہج اور اسلوب تدوین و ترجمہ

حامد کمال الدین کا علمی ذوق اس انتخاب کے لیے پہلے ہی سے موزوں تھا۔ ان کی تحریروں اور دروس کا ایک

بڑا حصہ عقیدہ، ایمان، منہج سلف، دعوت و تحریک، مسلم شخصیت کی تشکیل اور جدید فکری و تہذیبی سوالوں کے مطالعے سے متعلق ہے۔ جدید ہیومنزم، معاصر شرک، تہذیبی غلبے، دینی تعبیر، دعوتی منہج اور سلفی علمی روایت سے ان کی مستقل دل چسپی ان کے دوسرے علمی کاموں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کے تراث سے ان کا تعلق بھی عارضی یا اتفاقی نہیں۔ ایمان، عقیدہ، ملت اور دینی شناخت کے سوالوں میں وہ بار بار اسی علمی ذخیرے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اقتضاء الصراط المستقیم کا یہ اردو استفادہ ان کے مجموعی علمی و دعوتی ذوق ہی کی ایک توسیع معلوم ہوتا ہے۔

ان کا منہج واضح طور پر سلفی علمی روایت سے وابستہ ہے جس میں نصوص کی مرکزیت کے ساتھ ساتھ فہم سلف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے؛ اسی طرح متقدمین اہل السنۃ کے علمی تسلسل سے وابستگی اور معاصر مسائل کو اسی اصولی ذخیرے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش اس کے نمایاں عناصر ہیں۔ زیر نظر استفادے کے مآخذ بھی اسی سمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مترجم نے **شیخ ناصر بن عبد الکریم العقل** کی محقَّق اشاعت کو اساس بنایا ہے۔ تخریج، تحقیق اور متعدد علمی توضیحات میں اسی نسخے سے استفادہ کیا ہے اور اصل عربی متن کے صفحات کی نشان دہی بھی اسی لیے ساتھ رکھی گئی ہے کہ سنجیدہ طالب علم ضرورت کے وقت اس کی طرف رجوع کر سکے۔

اس کے ساتھ معاصر عرب علمی حلقوں میں 'اقتضاء' کی تدریسی روایت سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ شیخ عبد الرحمن بن ناصر البراک، شیخ محمد بن صالح العثیمین، شیخ خالد السبت اور شیخ صالح الفوزان نے اس کتاب کو درساً درساً پڑھایا ہے اور حامد کمال الدین نے مشکل فقہی، اصولی، لغوی اور تطبیقی مقامات پر ان دروس سے رجوع کیا ہے۔ اس سے ایک دوسری بات بھی نمایاں ہوتی ہے کہ 'اقتضاء' محض کتب خانے میں محفوظ ایک قدیم تصنیف نہیں؛ آج بھی عرب علمی و دعوتی حلقوں میں اسے پڑھا، پڑھایا اور زیر بحث لایا جاتا ہے۔ مترجم نے اسی زندہ علمی روایت کو اردو قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

موجودہ کام کو "ترجمہ" کے بجائے "اردو استفادہ" کہنا بھی خاصا بامعنی ہے۔ مترجم کہیں صرف عبارت منتقل کرتے ہیں؛ کہیں مشکل مقام کی گرہ کھولتے ہیں؛ کہیں معاصر عرب شارحین سے توضیح لیتے ہیں؛ کہیں عنوان قائم کرتے ہیں اور کہیں متن کو آج کے کسی فکری یا تہذیبی مسئلے سے جوڑتے ہیں۔ تاہم انھوں نے اپنی توضیحات اور اضافات کو اصل عبارت میں خلط نہیں کیا؛ قوسین، چھوٹے فونٹ اور دوسرے طباعتی امتیازات کے ذریعے یہ فرق قائم رکھا ہے کہ کہاں ابن تیمیہؒ کا متن ہے اور کہاں مترجم کی تعلیق۔ یہی وجہ ہے کہ اس

استفادے میں مترجم کی شرکت نمایاں ہونے کے باوجود اصل اور حواشی کی حدیں بڑی حد تک واضح رہتی ہیں۔ دقیق لغوی، اصولی، فقہی اور تخریجی مباحث کو بھی محض آسانی کے نام پر حذف نہیں کیا گیا۔ جہاں ابن تیمیہؒ نے طویل یا پیچیدہ بحث کی ہے، وہاں اسے باقی رکھا گیا؛ البتہ طباعت کے ذریعے عام قاری کو یہ سہولت دی گئی کہ وہ چاہے تو مرکزی بحث کے ساتھ آگے بڑھ جائے۔ اسانید میں ضرورت کے مطابق اختصار کیا گیا ہے۔ فصل بندی اور بہت سے عنوانات میں مترجم نے اپنی تدوینی بصیرت سے کام لیا ہے اور خود واضح کر دیا ہے کہ تمام سرخیاں ابن تیمیہؒ کی قائم کردہ نہیں۔

حامد کمال الدین کی نثر بھی اس کتاب کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔ اردو دینی نثر میں ان کا اسلوب خاصا منفرد بل کہ اپنی نوعیت کا ایک الگ نمونہ ہے۔ قدیم دینی اصطلاحات کے ساتھ جدید فکری لفظیات، تحریکی حرارت، محاوراتی برجستگی اور کہیں اچانک انگریزی تعبیرات، یہ سب ایک ہی عبارت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ نئے قاری کو ابتدا میں یہ اسلوب کچھ نامانوس محسوس ہو سکتا ہے مگر اس میں ایک خاص جاذبیت، کشش اور زور بھی ہے۔ اس طرح عبارت بے جان اور خشک علمی ترجمہ نہیں بنتی؛ اس میں مخاطب کو چونکانے، سوال پیدا کرنے اور مسئلے کو اپنے زمانے سے جوڑ دینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

مباحثِ کتاب کی سہ گانہ تقسیم

مترجم نے اس جلد کے مشمولات کو ''تاسیس، تاصیل اور تفریع'' کے تین بڑے حصوں میں منظم کیا ہے۔ یہ تقسیم اصل کتاب کی نہیں، مترجم کی وضع کردہ ترتیب ہے مگر اقتضاء کے داخلی بہاو کو سمجھنے میں بڑی معاون ہے۔ پہلے ملت کی بنیاد متعین ہوتی ہے؛ پھر موافقت و مخالفت کے اصول مستدل کیے جاتے ہیں اور آخر میں وہی اصول عملی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل پر منطبق ہوتے ہیں۔ موجودہ جلد اسی منصوبے کا پہلا حصہ ہے؛ پوری عربی کتاب کا ترجمہ ابھی مکمل نہیں اور بقیہ مواد دوسری جلد کے لیے رکھا گیا ہے۔

تاسیس: ملت کو متحقق کرنا

پہلے حصے میں ابن تیمیہؒ کسی مخصوص لباس یا تہوار سے بحث شروع نہیں کرتے بل کہ اس سے پہلے وہ اس دینی زمین کو واضح کرتے ہیں جس پر بعد کے تمام احکام کھڑے ہیں۔ بعثتِ محمدی ﷺ کے وقت مذہبی دنیا کی صورت حال، سابق ملتوں میں پیدا ہونے والا فساد، ''مغضوب علیھم'' اور ''ضالین''، فسادِ علم اور فسادِ عمل، سابق امتوں کے خصائل کا اس امت میں سرایت کرنا، طائفۂ منصورہ اور اہل صراطِ مستقیم کا ظاہر و باطن میں امتیاز؛ یہ

سب اسی حصے کے بنیادی مباحث ہیں۔

یہاں اصل سوال ''مشابہت'' سے پہلے ملت کا ہے۔ ملت صرف اعتقادی نسبت کا نام نہیں؛ وہ ایمان، عبادت، شعائر، اجتماعی حافظے، عادات اور طرزِ زندگی کا مجموعہ ہے۔ ابن تیمیہؒ کے استدلال میں ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہتے۔ باطن ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے اور مسلسل خارجی موافقت بھی باطن میں انس اور میلان پیدا کر سکتی ہے۔ اسی لیے بعد کی بحث میں بعض ظاہری رسوم محض صورت نہیں رہتیں، دینی و تہذیبی نسبت کا عنوان بن جاتی ہیں۔

حامد کمال الدین نے اس مقدمے کو عصر حاضر سے جوڑنے میں خاصی وسعت پیدا کی ہے۔ ان کے نزدیک اب تہذیبی اثر پذیری کا مسئلہ صرف کسی دوسری قوم کا لباس پہن لینے یا اس کی کوئی رسم اپنا لینے تک محدود نہیں۔ جدید تعلیمی و ثقافتی گلوبلائزیشن عقائد، اقدار، سماجی تصورات اور رہن سہن تک کو بہ تدریج ایک عالمی سانچے میں ڈھال رہی ہے۔ جدید علوم، ذرائعِ ابلاغ اور عالمی ثقافتی صنعت ایک خاص طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کو معمول بنا دیتی ہے اور فرد بسا اوقات یہ محسوس کیے بغیر اس کا صارف بنتا چلا جاتا ہے کہ اس کی اپنی دینی و تہذیبی ترجیحات کہاں بدل رہی ہیں۔ مترجم اسی پس منظر میں ابن تیمیہؒ کی ''ملت'' والی بحث کو آج کے مسلمان کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔

اسی سے وہ مذہبی تکثیریت اور تقاربِ ادیان کے بعض جدید تصورات کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مختلف مذاہب کے پیروکاروں سے عدل و احسان، گفت گو اور پر امن معاشرت اپنی جگہ؛ مگر یہ تصور دوسری چیز ہے کہ تمام مذہبی دعوے بالآخر ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں ہیں اور توحید و شرک، ایمان بالرسول اور انکارِ رسالت کے درمیان فرق ثانوی چیز ہے۔ مترجم ''ملتوں کا فرق'' اس مقام پر ایک بنیادی اسلامی مقدمے کے طور پر سامنے لاتے ہیں، یعنی اہل مذاہب میں باہمی تعلق ممکن ہے، دوسروں سے انصاف لازم ہے مگر عقیدے کے امتیازات کو تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔

ہیومنزم کے باب میں بھی ان کی تنقید انسان دوستی پر نہیں، اس فلسفیانہ انسان مرکزیت پر ہے جس میں انسان خود خیر و شر کا آخری حوالہ بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلام انسان کو اختیار دیتا ہے لیکن اس اختیار کو خدا سے بے نیاز اخلاقی ''حق'' میں تبدیل نہیں کرتا۔ یہاں سوال انسان کی عزت کا نہیں، آخری مرجعیت کا ہے؛ قدر کا فیصلہ وحی کرے گی یا انسان خود؟ مترجم اسی زاویے سے جدید ہیومنزم اور بعض لبرل تصورات کو

ملت اور شریعت کے مقابل ایک دوسرے اصولی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔

اسلام کی تفسیرِ نو بھی اسی سیاق میں ان کی توجہ کا موضوع بنتی ہے۔ جب ملت، شریعت، کفر و ایمان اور دینی اختصاص جیسی اصطلاحات کو جدید ذہنی سانچوں کے مطابق اس طرح از سر نو تعبیر کیا جائے کہ ان کا اصل امتیازی مفہوم باقی نہ رہے تو مترجم اسے محض زبان کی تبدیلی نہیں سمجھتے بل کہ دینی شعور کی ساخت میں تبدیلی خیال کرتے ہیں۔ یوں ''تاسیس'' کا حصہ ان کے ہاں ایک قدیم اعتقادی مقدمے سے بڑھ کر جدید مسلم ذہن کی تشکیل کا سوال بن جاتا ہے۔

تاصیل: موافقت و مخالفت کے اصول

دوسرے حصے میں وہ اصول جن کی بنیاد پہلے حصے میں رکھی گئی تھی، قرآن، سنت، آثار، اجماع اور فقہائے مذاہب کے اقوال سے مستدل کیے جاتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ متعدد قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہ اور تعاملِ سلف سے یہ بتاتے ہیں کہ اہل ایمان کا دینی امتیاز شریعت کے مختلف ابواب میں ایک معتبر اصول ہے۔ اس کے بعد حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے فقہی ذخیرے سے مثالیں سامنے آتی ہیں۔

اس حصے کی خاص اہمیت یہ ہے کہ یہاں مخالفت کو ایک بے قید اور میکانکی اصول نہیں رہنے دیا گیا۔ شرع من قبلنا، عاشورا، عرب و عجم اور دار الاسلام کے مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ محض یہ بات کافی نہیں کہ کوئی عمل یہود یا نصاریٰ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اس کی اصل ہماری شریعت میں بھی ثابت ہے تو مشترک ہونا بہ ذاتِ خود سببِ ممانعت نہیں۔ ابن تیمیہ کفار کے اعمال کو بھی مختلف قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: کچھ امور دونوں شریعتوں میں مشروع رہے؛ کچھ ان کے لیے مشروع مگر ہمارے لیے منسوخ ہوئے، اور کچھ سرے سے خود ساختہ اور غیر مشروع ہیں۔ اس تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ظاہری مماثلت کا حکم ایک نہیں۔

یہی اصول تشبہ کی پوری بحث کو فقہی توازن عطا کرتا ہے۔ **اختصاص، قصد، شرعی اصل اور سیاق**، سب کا اعتبار ہو گا۔ کسی غیر مسلم قوم میں پایا جانے والا ہر کام مذہبی شعار نہیں اور ہر مشترک انسانی یا انتظامی عمل کو تشبہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دوسری طرف کسی خاص مذہبی شعار کو جانتے بوجھتے اختیار کرنا محض ایک بے معنی ظاہری موافقت بھی نہیں رہتا۔

دار الاسلام اور مختلف حالات سے متعلق بحث اس توازن کو اور نمایاں کرتی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ بعض مواقع پر یہ گنجایش تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کسی ماحول میں ظاہری مخالفت نقصان کا سبب بن رہی ہو اور کسی

محدود موافقت سے دینی مصلحت، دعوت، مسلمانوں کا تحفظ یا کوئی دوسرا صالح مقصد حاصل ہوتا ہو تو حکم حالات کے لحاظ سے بدل سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مخالفت'' خود کوئی مستقل مقصود نہیں؛ اصل مقصد دین، ملت اور شرعی مصلحت کا تحفظ ہے۔

عرب و عجم کی بحث بھی اسی حصے میں آتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ عربی زبان اور اولین عربی اسلامی معاشرے کو وحی، صحابہ اور دینی شعائر سے نسبت کے باعث خاص اہمیت دیتے ہیں لیکن اس موضوع کو جدید نسلی برتری کے تصورات میں رکھنا درست نہیں۔ خود ان کے ہاں ایمان و تقویٰ اصل دینی میزان ہیں۔ مترجم اس بحث کو زیادہ تر تہذیبی تسلسل، دینی زبان اور اسلامی شناخت کے زاویے سے سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔

یہاں ان کی معاصر تطبیق زبان سے آگے بڑھ کر ریاست اور اجتماعی نظم تک پہنچتی ہے۔ کلاسیکی دار الاسلام اور جدید نیشن اسٹیٹ کے درمیان فرق ان کے لیے خاص توجہ کا موضوع ہے۔ جدید ریاست قوم، وطن اور شہریت پر قائم ہوتی ہے جب کہ کلاسیکی اسلامی اجتماع میں دین اور ملت کو بنیادی نسبت حاصل تھی۔ مترجم بعض جدید اعتراضات، خصوصاً شہری حقوق اور اہل ذمہ کی بحث کو اسی تقابل کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جدید تناظر میں یہ ابن تیمیہؒ کی بہ راہ راست سیاسی بحث نہیں بل کہ ان کے اصولوں سے مترجم کی ایک معاصر تطبیق ہے۔

تفریع: اعیاد، زبان اور فقہِ تعامل

تیسرا حصہ کتاب کا سب سے عملی حصہ ہے اور یہی اقتضاء کی عمومی شہرت کا بڑا سبب بھی ہے۔ یہاں اعیاد، تہوار، زبان، درجاتِ تشبہ، تحائف، بازار، خرید و فروخت، ذبائح، اجارہ، جایداد اور غیر مسلموں سے دوسرے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ لیکن پہلے دو حصوں کے بعد یہ مسائل منتشر فقہی جزئیات نہیں رہتے؛ ان کے پیچھے ملت اور شعار کا ایک پورا اصولی پس منظر موجود ہوتا ہے۔

ابن تیمیہؒ عید کو محض تفریح اور خوشی کا دن نہیں سمجھتے؛ ان کے نزدیک وہ کسی ملت کی ''شرع، منہاج اور مناسک'' سے نسبت رکھنے والا نمایاں اجتماعی شعار ہے۔ تہوار میں ایک قوم کا عقیدہ، تاریخ، اجتماعی حافظہ اور مذہبی شناخت ایک خاص وقت اور خاص علامتوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تہوار کے باب میں موافقت کی حساسیت عام عادات سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

مترجم یہاں ایک اہم معاصر سوال اٹھاتے ہیں: کیا تہوار صرف وہی ہے جس کی صریح مذہبی نسبت ہو؟

مدینہ کے قبل از اسلام دو معروف ایام کے بارے میں حدیث میں کسی واضح مذہبی عقیدے کا ذکر نہیں؛ وہ کھیل اور تفریح کے موروثی ایام تھے۔ مترجم انھیں آج کی زبان میں کسی درجے کا کلچرل یا قومی تہوار سمجھتے ہیں۔ اس سے جدید قومی اور ثقافتی ایام کے بارے میں ایک اصولی سوال ضرور پیدا ہوتا ہے؛ اگرچہ یومِ آزادی یا یومِ وطن جیسے مخصوص جدید ایام پر اس جلد میں کوئی براہِ راست اور متعین حکم مذکور نہیں جو کہ ہونا چاہیے تھا۔

عیسائی اعیاد کے سلسلے میں کرسمس اور ایسٹر کی بحث زیادہ نمایاں ہے۔ ابن تیمیہؒ اپنے عہد کے مسیحی تہواروں، مخصوص دنوں، خوراک، اجتماعات اور رسوم کا ذکر کرتے ہیں جب کہ مترجم انھیں جدید کرسمس اور ایسٹر کے ماحول سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی مذہبی تہوار کو صرف ''سماجی'' یا ''ثقافتی'' کہہ دینے سے لازماً اس کی مذہبی اصل ختم نہیں ہو جاتی۔ لباس، کھانا، تحفہ، تعطیل اور تفریح بعض اوقات اسی مذہبی شعار کی ثقافتی پرتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی سیاق میں برصغیر میں کرسمس کے لیے ''بڑے دن'' جیسی تعبیر تک ان کی توجہ جاتی ہے۔

جمعہ اور اتوار کی بحث بھی مترجم کی معاصر تطبیقات میں خاص دل چسپی رکھتی ہے۔ مسلم ممالک میں ہفتہ وار تعطیل کے جمعہ سے ہفتہ یا اتوار کی طرف منتقل ہونے کو وہ محض انتظامی تبدیلی نہیں سمجھتے؛ ان کے نزدیک اجتماعی وقت اور ہفتہ وار زندگی کا نقشہ بھی تہذیبی اثر پذیری کا حامل ہو سکتا ہے۔ اگر بچوں اور خاندانوں کی تفریح، اجتماع اور سماجی زندگی کا اصل مرکز اتوار بن جائے اور جمعہ صرف نماز کی ایک ساعت تک محدود ہو تو وہ اسے تہذیبی ترجیحات میں تبدیلی کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہاں بھی اصل اور تطبیق میں فرق واضح رہنا چاہیے؛ یہ ابن تیمیہؒ کا صریح بیان نہیں بل کہ ان کے اصول سے مترجم کا معاصر استنباط ہے۔

زبان کے باب میں امام ابن تیمیہؒ کی رطانۃ سے متعلق بحث کو مترجم نے خاصی وسعت سے بیان کیا ہے۔ عربی زبان قرآن، سنت اور اسلامی علوم سے اپنی نسبت کے باعث مستقل اہمیت رکھتی ہے مگر مترجم اس اصول کو اردو، فارسی، ترکی اور دوسری مسلم معاشروں کی زبانوں تک بھی تہذیبی مفہوم میں پھیلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر ضروری فرنگی لفظیات اور رومنائزیشن کا غلبہ کبھی محض لسانی تبدیلی نہیں رہتا، تہذیبی مرعوبیت کی علامت بھی بن سکتا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ کوئی زبان فی نفسہٖ مسلمان یا کافر نہیں۔ علمی، تعلیمی، کاروباری اور دعوتی ضرورت کے لیے دوسری زبان سیکھنا نہ صرف جائز بل کہ بعض مواقع پر مفید اور ضروری ہو سکتا ہے۔ مسئلہ دوسری زبان جاننا نہیں، اپنی دینی و تہذیبی شناخت سے مرعوبانہ دست برداری ہے۔

تشبہ کے درجات سے متعلق بحث بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کسی ایسے عمل کو جانتے بوجھتے اختیار کرنا جو دوسری ملت کا مذہبی اختصاص ہے؛ کسی رسم کی اصل سے ناواقف ہو کر اسے اپنالینا، اور کسی ایسی چیز میں موافقت جو سرے سے کسی مذہب کا شعار ہی نہیں؛ یہ تینوں صورتیں ایک درجے میں نہیں۔ یہ امتیاز اس عمومی طرزِ فہم کی اصلاح کرتا ہے جس میں ہر ظاہری موافقت کو بلا تفریق ممنوع تشبہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

کتاب کا آخری عملی دائرہ غیر مسلموں کے ساتھ تعامل ہے۔ یہاں ابن تیمیہؒ کی فقہی تفصیلات خاص طور پر قابل توجہ ہیں کیوں کہ وہ ملتوں کے امتیاز کو معاشرتی انقطاع میں تبدیل نہیں کرتے۔ عام خرید و فروخت، کسی مذہبی تقریب میں شرکت، مخصوص مذہبی شعار کے قیام میں مدد، تحفہ، اجارہ، مکان و جایداد، ذبائح اور بازار، ان سب کے احکام میں فرق کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر کسی غیر مسلم کے تہوار کے دن بازار میں معمول کی خریداری بہ ذاتِ خود مذہبی شرکت نہیں، بہ شرطے کہ آدمی کسی ممنوع مذہبی عمل میں شریک نہ ہو اور اس کی مدد نہ کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف ایسی چیز فراہم کرنا جو خاص اسی مذہبی شعار کے قیام کے لیے استعمال ہو، دوسری نوعیت رکھتا ہے۔ یہی فرق تحائف اور ذبائح میں بھی سامنے آتا ہے۔ اہل کتاب کا عام ذبیحہ اور کسی مخصوص مذہبی تقریب یا غیر اللہ کی تعظیم کے لیے کیا گیا ذبیحہ یک ساں نہیں۔

ان مباحث میں مترجم نے البراک، خالد السبت، الفوزان اور دوسرے معاصر اہل علم کی توضیحات سے خاصی مدد لی ہے۔ کہیں کسی فقہی اصطلاح کے قدیم استعمال کو واضح کیا گیا ہے؛ کہیں نصوص کے بہ ظاہر تعارض کی تشریح کی گئی ہے؛ کہیں کسی ذبیحہ یا مذہبی معاونت کی صورت کو تفصیل سے سمجھایا گیا ہے۔ اس طرح اصل فقہی مواد اور معاصر تدریسی شرح ایک دوسرے کے معاون بن جاتے ہیں۔

اس پوری بحث کا حاصل ایک بنیادی فرق کی صورت میں سامنے آتا ہے: دینی امتیاز، معاشرتی انقطاع نہیں اور معمول کا تعامل، مذہبی تحلیل نہیں۔ ابن تیمیہؒ ایک طرف مسلمان سے اپنے شعائر اور دینی شخصیت میں استقلال چاہتے ہیں، دوسری طرف ہر شہری، معاشی اور انسانی تعلق کو تشبہ نہیں بناتے۔ اس طرح 'اقتضاء' کا مطالعہ محض مخالفتِ کفار کے نعرے سے بلند ہو کر ایک باقاعدہ **فقہِ امتیاز و تعامل** کی صورت اختیار کرتا ہے۔

مجموعی قدر و قیمت

حامد کمال الدین نے اس اردو استفادے کی صورت میں جو امتیازی خدمت سر انجام دی ہے اس میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے 'اقتضاء الصراط المستقیم' کو چند رسوم اور ممنوعات کے محدود تعارف سے

نکال کر اس کے **اصل اصولی موضوع** کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ملت، شعار، ظاہر و باطن، موافقت و مخالفت اور دینی امتیاز؛ یہ وہ فکری محور ہے جس کے گرد کتاب کے منتشر نظر آنے والے مباحث دراصل منظم ہوتے ہیں۔ مترجم نے اسی داخلی ربط کو اردو قاری کے سامنے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوسرا اور شاید زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اس قدیم علمی ذخیرے کو آج کی مؤثر فکری و تہذیبی بحثوں سے مربوط کرکے دکھایا ہے۔ گلوبلائزیشن، مذہبی تکثیریت، تقاربِ ادیان، ہیومنزم، جدید ریاست، زبان، تہوار اور روزمرہ معاشرت؛ یہ تمام مسائل بعینہٖ ابن تیمیہؒ کے عہد میں موجود نہ تھے مگر مترجم نے ان کے وضع کردہ اصولوں سے روشنی لے کر انھیں اپنے زمانے کے فکری و تہذیبی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے کم از کم یہ حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ ہمارا کلاسیکی علمی تراث محض ماضی کی یادگار نہیں؛ اس میں ایسی اصولی بصیرت اور فکری ثروت موجود ہے جو نئے حالات کو سمجھنے، ان کا تجزیہ کرنے اور ان سے معاملہ کرنے میں آج بھی رہ نمائی دے سکتی ہے۔

علمی تراث کی قدر و قیمت صرف یہ نہیں کہ وہ محفوظ رہے بل کہ یہ ہے کہ وہ آنے والے زمانوں کے سوالوں کو سمجھنے میں بھی مدد دے۔ 'اقتضاء الصراط المستقیم' کے اس اردو استفادے میں حامد کمال الدین نے ابن تیمیہؒ کے متن کو اُردو میں منتقل ہی نہیں کیا، بڑی محنت اور مہارت سے اس کی اصولی بصیرت کو اپنے عہد کے فکری اور تہذیبی مسائل سے جوڑ کر دکھایا ہے؛ یہی اس کام کی اصل اہمیت ہے۔

تراث اسی صورت میں زندہ رہتا ہے، جب وہ صرف الماریوں میں محفوظ نہ ہو بل کہ نئے زمانے کے سوالوں پر بھی روشنی ڈالے۔ حامد کمال الدین نے 'اقتضاء الصراط المستقیم' کے اس اردو استفادے میں امام ابن تیمیہؒ کے متن کو اسی زندہ نسبت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اصل کتاب کی روح کو پورے طور سے برقرار رکھتے ہوئے اسے اپنے عہد کے فکری و تہذیبی مسائل سے ہم کلام کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب ہر سنجیدہ علمی لائبریری اور مکتبے کا حصہ ہونی چاہیے؛ تخصص (خصوصاً فکر و عقیدہ) کے نصاب میں اسے شامل ہونا چاہیے اور مدارس، جامعات اور مطالعاتی مراکز میں اس کے باقاعدہ اجتماعی مطالعے اور مذاکرے کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

کتاب کے حصول کے لیے مطبوعاتِ ایقاظ سے رابطہ کیا جا سکتا ہے: +92 329 7833252۔

مقالات عقیدہ ومنہج؛ تعارف وتجزیہ

ڈاکٹر حافظ آصف جاوید
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

ہماری مذہبیات کی تاریخ میں چند ہی اہل قلم ہوں گے جو علم و دانش کے بحر ذخار میں غواصی کریں اور فہم و بصیرت کے یاقوت و مرجان بر آمد کر لائیں، فکر و فن کا کوئی نیا افق دریافت کریں اور اپنے بعد خاص حلقہ اثر پیدا کر جائیں۔ ہمارے ممدوح ڈاکٹر حافظ محمد زبیر صاحب کا شمار، انہی معدودے چند اصحابِ فکر میں ہوتا ہے، جن کے مرتب کردہ "مقالات عقیدہ و منہج" اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں۔

مقالات کا انتساب، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہے، جنہوں نے کلامی فرق کے رد میں "فقہ الاکبر" لکھ کر سلف صالحین کے منہج پر 'اصول توحید' کو مرتب کیا۔ مقالات میں عقیدہ اور منہج کے دو بنیادی موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور انہیں کل بارہ ابواب اور مزید فصول میں سمویا گیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب اول کا عنوان "توحید اسماء وصفات" ہے، جس میں مقالہ نگار نے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے کہ اسماء وصفات کے باب میں، جمہور اہل سنت اور فقہائے اربعہ تفویض کے قائل تھے۔ مقالہ نگار نے مستند اقتباسات سے اس موقف کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ فقہائے اربعہ: امام ابو حنیفہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کا اتفاقی عقیدہ یہ ہے کہ وہ صفات کے حقیقی معنے کا اثبات کرتے ہیں مگر اس کی کیفیت بیان نہیں کرتے گویا اسماء وصفات کے باب میں سلفی حضرات وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو صحابہ کرام، تابعین عظام، فقہائے امت اور جمہور اہل سنت کا عقیدہ تھا جبکہ احناف میں سے ماتریدیہ اور اشاعرہ توحید اسماء وصفات کے باب میں جمہور اہل سنت کے عقیدے پر نہ ہیں۔ اسی باب میں کلام نفسی اور کلام لفظی کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہے جو اشاعرہ اور ماتریدیہ کی بابت، محترم ومکرم شیخ واصل واسطی حفظہ اللہ کے ایک توضیح طلب خط کے جواب پر مشتمل ہے!

باب دوم کا عنوان "توحید الوہیت" ہے۔ مقالہ نگار نے اس باب میں صوفی عبد الحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر 'معالم الفرقان' سے منتخب اقتباسات اور حوالہ جات دیے ہیں، جو مروجہ قبر پرستی کے شدید رد پر مشتمل ہیں۔ اسی باب میں ڈاکٹر مسعود عثمانی کے افکار و نظریات کا تنقیدی تعارف بھی بیان کیا گیا ہے کہ معاصر کشفی اور الہامی تصوف کے رد عمل سے وجود میں آنے والا ایک شدت پسند اور انتہا پرست فرقہ ہے، جو عذاب قبر کو جھٹلاتا،

دینی خدمات پر اجرت کو حرام سمجھتا اور سب سے بڑھ کر امت کی تکفیر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس باب میں تکفیر، بیان کفر اور توسل کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا نظریہ، ارطغرل اور شرکیہ تصوف، دربار کی چوکھٹ پر عمرانی سجدہ اور جنات سے خدمت جیسے توحید الوہیت سے متعلقہ موضوعات اس باب میں شامل ہیں۔

باب سوم ''توحید ربوبیت'' سے معنون ہے۔ مقالہ نگار نے نظریہ وحدت کے تناظر میں، شیخ ابن عربی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے مابین تقابل کرتے ہوئے ہر دو مؤقف کے درمیان چھ جوہری فروق کا استخراج کیا ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے موقف سے متعلق سات مزید توضیحات بھی بیان کی ہیں۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ متقدمین علمائے کرام نے شیخ ابن عربی کے وحدتی نظریہ پر تنقید اور تکفیر کی ہے مگر ان کی تنقیدات اور تکفیرات کو ڈاکٹر صاحب مرحوم پر چسپاں کرنا مناسب نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وحدت کا نظریہ دین ومذہب کا نہیں بلکہ سائنس وفلسفے کا مسئلہ تھا، جو اس باب میں ایک بالکل نئی تعبیر ہے اور جس سے اختلاف کرنا ممکن ہے مگر اسے بنیاد بنا کر مرحوم ڈاکٹر صاحب کی تکفیر کرنا درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا موقف واضح کرنے کے سبب، حیرت ہے کہ ہمارے بعض دوست مقالہ نگار کو اسراری ہونے کا طعنہ دیتے ہیں حالانکہ پہلے باب میں مقالہ نگار نے فقہائے اربعہ کا سلفی العقیدہ ہونا بھی ثابت کیا ہے پھر اسراری کے بجائے انہیں سلفی سمجھنے میں کیا مانع ہے، جبکہ وہ اظہار بھی کر چکے ہیں کہ اسماء وصفات کے باب میں وہ جمہور اہل سنت اور محدثین کرام کے عقیدہ پر ہیں!

باب چہارم میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے اس نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے کہ ''غلام احمد قادیانی نے ختم نبوت کا تصور، شیخ ابنِ عربی کے نظری تصوف سے اخذ کیا ہے''۔ مقالہ نگار نے اس باب میں، شیخ ابنِ عربی اور مرزا قادیانی کے تصور ختم نبوت کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ ابن عربی اور قادیانی اس لحاظ سے باہم متفق ہیں کہ تشریعی نبوت ختم ہو چکی ہے البتہ غیر تشریعی نبوت جاری ہے، اور اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ابن عربی کے اقتباسات نسبتاً مبہم ہیں، جو اپنے اندر تاویل کی گنجائش رکھتے ہیں جبکہ قادیانی عبارات میں تاویل کی گنجائش موجود نہیں ہے کہ وہ دعوائے نبوت میں نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق ہمارے قدیم فقہائے کرام میں سے بہت سوں نے ابن عربی پر تضلیل اور تکفیر تک کا شدید نقد کیا ہے چنانچہ ابن عربی سے متعلق اسی موقف پر قائم رہنا چاہئے اور اس کے بارہ میں بعد کے کسی ذو معنٰی اور سطحی موقف کی بنیاد پر، قادیانی کو مارجن دینے کا جواز تلاش کرنا لایعنی ہے۔ یا وہ قادیانی کی تکفیر کا فرض تو ادا کریں لیکن ابن عربی کی مبہم عبارات کو بنیاد پر اس کی عدم تکفیر کی گنجائش پیدا کریں قطعاً درست نہیں ہے۔

باب پنجم میں علامہ ابن حزمؒ کا بنیادی تعارف اور علمی مقام بیان کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اہم کلامی اور فقہی امور جیسے اسماء وصفات الٰہی، زمان و مکان جسم، علت و معلول، جبر و قدر، روح و نفس اور اشیاء کے حسن وقبح کے علاوہ نبوت، آخرت اور ملائکہ سے متعلق ظاہری نقطہ نظر کو تفصیلاً ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہائے ماقبل کے برعکس علامہ ابن حزمؒ نے علم وفن کے ہر باب میں اپنا مکمل بیانیہ پیش فرمایا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق ابن حزم کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کو چند شذوذ اور تفردات کی بنیاد پر ظاہریت کا طعنہ دینا گویا ان کے علمی ورثہ سے محروم ہونے کے مترادف ہے۔ علامہ ابن حزمؒ سے علمی اختلاف رکھنا ہر صاحب علم کا حق ہے مگر ان کے علمی مقام و مرتبے کا انکار کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اعتقادی مسائل میں اگرچہ سلفی حضرات، ابن حزم سے اختلاف رکھتے ہیں اور فقہی احکام میں حنفی احباب انہیں قبول نہیں کرتے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ کلامی امور کی بابت، ان کے ظاہری منہج کو اہل کلام ایک مصدر سمجھتے ہیں اور ان کے عدم تقلیدی رجحان کو، اہل حدیث کی ایک بڑی جماعت سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے!

مقالات کے چند ابواب میں عالم کے حدث وقدم، کشف والہام اور عقل و نقل سے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا موقف بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام کی شخصیت، اسلام کے انتہائی سادہ دین کو نہایت اعلی حکمت کے ساتھ پیش کرنے کی خداداد صلاحیتوں سے مالامال تھی۔ مقالہ نگار کے خیال میں شیخ الاسلام کو پڑھ کر یہ تاثر زائل ہو جاتا ہے کہ سلفیت، ظاہریت کا اپڈیٹڈ ورژن ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ سلفیت ایک مستقل فکری منہج کا نام ہے اور علامہ ابن تیمیہ سلفی منہاج کی تفہیم کا معیاری پیمانہ ہیں چنانچہ معاصر سلفی علماء کے مابین اختلاف کے وقت ابن تیمیہ، سلفی مکتب فکر کی اسٹینڈرڈ تعبیر شمار ہوتے ہیں!

باب دہم میں فہم سلف کی حجیت کا مسئلہ نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یہ باب درحقیقت چند بنیادی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے اور ان جوابات کا حاصل یہ ہے کہ مقالہ نگار کے نزدیک سلف صالحین سے مراد حضرات صحابہ کرام کی جماعت ہے کہ اس پر تمام امت کا اتفاق ہے جبکہ تابعینِ عظام اور تبع تابعین کو سلف میں شمار کرنا بہرحال مختلف فیہ ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق، فہم سلف سے مراد کسی آیت کی تفسیر یا حدیث کی توضیح بیان کرنے والا فہم مراد ہوتا ہے، سلف کا مجرد فہم مراد نہیں ہوتا۔ فہم سلف کے حجت ہونے یا نہ ہونے کی بابت مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ سلف صالحین کا متفقہ فہم حجت ہے، جس کا دوسرا نام گویا اجماع امت ہے اور سلف کا اختلافی فہم حجت نہیں ہے کیونکہ کسی مسئلے پر سلف کے مختلف اقوال کا موجود ہونا خود اس بات کا

ثبوت ہے کہ سلف کے نزدیک ایک کا قول دوسرے پر حجت نہیں تھا پھر مابعد زمانے پر حجت کیسے ہو سکتا ہے! لہٰذا سلف کے مختلف فیہ اقوال کو کتاب و سنت پر پیش کیا جائے گا اور ان میں سے جو قول بھی کتاب و سنت کے مطابق ہو گا، اسے قبول کیا جائے گا۔ مصنف کے خیال میں البتہ، سلف کے مختلف اقوال کا مطالعہ کرنا انتہائی مفید ہے کہ اس سے مجموعی طور پر سلف کی روش کا علم ہوتا ہے اور اسی روش کو ہم منہجِ سلف کا نام دے سکتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ کتاب و سنت کا مطالعہ کرتے وقت منہجِ سلف پر کاربند رہنا ضروری ہے اور ان کا اجماعی نتیجہ فکر قبول کرنا بھی لازم ہے مگر ان کے مختلف فیہ اقوال کو حجت سمجھنا درست نہیں ہے اور اس قسم کا فہم سلف اگرچہ، دین کا مصدر نہیں ہوتا مگر فہم دین کا ذریعہ ضرور ثابت ہوتا ہے۔

فہم سلف کے ساتھ ساتھ مقالات میں اجماعِ امت کا تصور بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ مقالہ نگار کی رائے میں، معروف اصطلاحی تعریف کے مطابق اجماع کا عملاً وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے اور جن امور پر حضرات صحابہ کرام کے اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے، ان کی حقیقت یہ ہے کہ شورائی اجتہاد کے نتیجہ میں انتظامی نوعیت کے بعض معاملات پر صحابہ کرام کا اتفاق ہو گیا تھا اور یہی اجماعِ صحابہ کی اصل صورت تھی۔ مقالہ نگار امام شافعیؒ کے تصور اجماع سے متّفق دکھائی دیتے ہیں کہ ضروریاتِ دین اور مبادیات شرع سے متعلق اجماع کا دعویٰ کرنا درست ہو گا کہ علماء چھوڑ عوام کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک، مبادیات دین پر اجماع ہونا اور فہم سلف کے منہج پر اجماع ہونا، نہ صرف ممکن ہے بلکہ شرعاً حجت بھی ہے اور شرعی اصول کے علاوہ انتظامی امور میں بھی اجماع پر کاربند رہنا امت کے لیے لازم ہے ورنہ اجماع کے انکار سے دین محفوظ نہیں رہ پائے گا کہ دین کے متفق علیہ اصول اور مجمع علیہ ارکان بھی مختلف فیہ ہو جائیں گے اور ماہ رخ اسلام کی دیدہ زیب صورت، معاذ اللہ مسخ ہو کر رہ جائے گی!

باب یازدہم تعامل بین المسالک کے حوالے سے ہے اور یہ بڑی خاصے کی چیز ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق بین المسالک تعامل کا بنیادی مقصد، فرقہ وارانہ تعصبات کم کرنا، علمی اختلافات میں شائستگی دکھانا اور قومی معاملات میں اجتماعی جدوجہد کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔ مقالہ نگار نے کتاب و سنت کی روشنی میں تعامل کی چند صورتیں ذکر کی ہیں اور سلف صالحین کے اقوال اور اکابر علمائے اہل حدیث کے عملی مظاہر کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ بعض مسائل پر اسلاف کے اقوال، خاص ماحول اور مخصوص حالات کے سیاق میں صادر ہوئے ہیں، انہیں سیاق وسباق سے ہٹ کر آج کے معاشروں پر جاری کرنا گویا شان نزول سے آنکھیں بند

کر کے قرآن سمجھنا ہے۔ چنانچہ قدیم سلفی اقوال کی درست تفہیم کے لیے معاصر سلفی علماء کی تعبیر ہی زیادہ موزوں ہے۔ مقالہ نگار نے اسی تناظر میں چند پاکستانی شخصیات اور جامعات کا نقطہ نظر اور عملی مظہر بھی سے بیان کیا ہے۔ باب ہذا میں سطحی منہجیت اور سعودی سلفیت اور درآمدی مدخلیت پر نقد و تبصرہ بھی شامل ہے۔

باب ہذا میں مقالہ نگار نے اہل حدیث حضرات پر، سلف صالحین کا منہج فکر اور فہم شریعت واضح کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ماضی قریب کے سلفی اکابر کا دیگر مسالک کے علماء سے حسنِ تعامل بھی پیش کیا ہے تاکہ تنگ نظری اور خشک مزاجی کے عہد میں وسعت فکری اور خوش اخلاقی کو رواج دے سکیں، اپنی مبارک سعی میں مقالہ نگار کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، فیصلہ بہر صورت معتدل قارئین ہی کریں گے!

آخری باب کا عنوان منہج سلف اور کرنے کا اصل کام ہے، جس میں عمومی قسم کے مسائل کو اسلامائز کر کے پیش کیا گیا ہے یہ باب دراصل مختلف نفسی اور نفسیاتی، طبی اور طبعی، سماجی اور سیاسی موضوعات سے متعلقہ سوالات کے جوابات یا مقالہ نگار کے حاصلاتِ فکر کا مجموعہ ہے اور اس کے مذکورہ موضوعات اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ ہماری نسلِ نو کے مسائل پر مشتمل ہیں اور مقالہ نگار کے مطابق، منہجِ سلف کے پیروکاروں کا فرض ہے کہ جدید مسائل پر اپنے عوام کو شرعی رہنمائی فراہم کریں اور اس رہنمائی کے لیے ظاہر ہے کہ معاصر مسائل سے آشنا ہونا ضروری ہے ورنہ تعلیم یافتہ اہل حدیث کی ایک بڑی تعداد چرب زبان متجددین اور منحرفین کا شکار ہوئے جا رہی ہے لہذا دینی مدارس کے تحت "دارالافتاء" کے ساتھ ساتھ "دارالفکر" قائم کرنا بھی وقت کی اشد ضرورت ہے، جو پیش آمدہ مسائل میں سلفی منہاج پر نہ صرف عوام کی راہنمائی کرتا ہو بلکہ فضلائے مدارس کے لیے فکری تربیت کا اہتمام کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل ہونا چاہیے!

تعصب اور تنفر کے ماحول میں سنجیدہ مسائل پر قلم اٹھانا اور اپنے حاصلاتِ مطالعہ کا پیش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اور یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مدح و ذم کے نفسیاتی ردعمل سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جائے۔ ہماری رائے میں مقالات عقیدہ و منہج، اسی نوع کی ایک عمدہ کاوش ہے جو یقیناً لائقِ مطالعہ اور قابلِ داد ہے کہ مقالات میں انتہائی سنجیدہ مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور سنجیدہ موضوعات محض سنجیدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے دیرپا اور دور رس اثرات کے باعث عرصے تک زندہ بھی رہتے ہیں کہ وہ فہیم عناصر کے دل کی آواز ہوتے ہیں اور اپنے بعد خاص حلقہ چھوڑ جاتے ہیں اور یہی ان موضوعات کے مفید اور مؤثر ہونے کا ثبوت ہوتا ہے!

سالانہ تقریبِ تقسیمِ اسناد اور تحفظِ حرمین کانفرنس

قاری ظہیر ادریس

جامعہ لاہور الاسلامیہ، پاکستان کا عظیم وقدیم تعلیمی و تحقیقی ادارہ ہے جو علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ کے میدان میں ۷۰ برس سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ۱۸ عمارتوں میں پھیلا ہوا یہ جامعہ، اپنے متنوع تعلیمی شعبہ جات، زیر تعلیم طلبہ کی بڑی تعداد اور تجربہ کار اساتذہ کی بنا پر پاکستان میں سلفی مکتبِ فکر کا اہم ترین اور ممتاز جامعہ ہے۔ ۳۵ سال قبل پاکستان میں علوم قراءات سبعہ وعشرہ کی پہلی عظیم الشان درسگاہ اسی ادارے میں قائم ہوئی تھی، جس سے فیض پانے والے قراء اندرون ملک کے علاوہ خلیجی ممالک میں قرآن کریم کی خدمت میں نمایاں کردار انجام دے رہے ہیں۔

جامعہ کی طرف سے گزشتہ ۵۷ برس سے عظیم الشان علمی ماہ نامہ محدث شائع کیا جارہا ہے، جو اپنی تحقیقی معیار کی بنا پر وقیع تر حیثیت کا حامل ہے۔ اسی جامعہ کے تحت اردو زبان میں دینی کتب ورسائل پر مشتمل دنیا میں اردو زبان کی سب سے بڑی ریسرچ ویب سائٹ "محدث لائبریری" کے نام سے دو عشروں سے جاری ہے۔ اسی طرح "محدث فورم"، "محدث فتویٰ" اور محدث کے سابقہ کے ساتھ تقریباً دس معروف ویب سائٹ کام کررہی ہیں۔ اسی جامعہ کے تحت لاہور شہر میں اسلامی علوم کی عربی کتب پر مشتمل سب سے بڑی لائبریری "مکتبہ رحمانیہ (محدث لائبریری)" ۹۹۔ جے بلاک ماڈل ٹاؤن، لاہور میں قائم ہے۔

جامعہ ہذا کے بانی ومؤسس ڈاکٹر مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کو سعودی علما کے شاگرد ہونے کے ناطے شروع سے مفتی اعظم شیخ ابن بازؒ، دیگر کبار علما اور سعودی حکومت کی بھرپور تائید حاصل رہی ہے۔ سعودی عرب نے ۱۹۷۰ء میں اس جامعہ کی اسناد کو برابر کی سطح پر منظوری دی تھی اور سعودی وزارت ہائر ایجوکیشن نے یہاں سے تعلیم مکمل کرنے والے فضلا کو سعودی عرب میں ایم اے سطح پر داخلے کی منظوری بھی دی۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی جامعات اس کے طلبہ کو ترجیحی بنیادوں پر داخلہ دیتے ہیں۔ اس سال بھی پاکستان بھر سے مدینہ یونیورسٹی میں سب سے زیادہ داخلہ جامعہ ہذا کے طلبہ کو ملا ہے، الحمد للہ۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ کی آخری سال کی ڈگری کو حکومت پاکستان ایم اے عربی واسلامیات کے مساوی

قرار دیتی ہے اور جامعہ ہذا کو پنجاب حکومت نے بھی سنہ ۲۰۱۱ء سے باضابطہ کالج (LISS) کے طور پر منظور کیا ہوا ہے۔ امسال جامعہ لاہور الاسلامیہ کے شعبہ خواتین کی طالبات نے پنجاب بھر میں بورڈ کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

۱. سالانہ تقریب تقسیم اسناد و انعامات

اسی علمی و تعلیمی تسلسل کے تحت جامعہ کے مرکزی کیمپس "البیت العتیق" میں ۱۰/اکتوبر ۲۰۲۶ء کو ششماہی تقریبِ تقسیمِ اسناد و انعامات منعقد ہوئی۔ یہ تقریب جامعہ کی تعلیمی خدمات، طلبہ کی علمی کامیابیوں اور اساتذۂ کرام کی تدریسی محنت کے اعتراف کا ایک باوقار موقع تھی، جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے قائدین جماعت، علماء، مشائخ، اساتذۂ کرام، فضلاء، طلبہ اور وابستگانِ جامعہ نے شرکت کی۔

تقریب میں مجموعی طور پر سو سے زائد اسناد تقسیم کی گئیں۔ قراءاتِ عشرہ کبریٰ کے ۴۰ طلبہ کو ان کی تعلیمی کامیابی پر اعزازات سے نوازا گیا۔ ۳۰ طلبہ کو سندِ فضیلت (عالمیہ) عطا کی گئی، جو ان کے تعلیمی سفر کے ایک اہم مرحلے کی تکمیل کی علامت ہے۔

جامعہ میں زیر تعلیم طلبہ نے اپنی خصوصی تعلیمی کارکردگی پیش کی۔ عام طور پر جو طلبہ ۸۵ فیصد سے زائد نمبر ثانویہ خاصہ میں حاصل کرتے ہیں یا بعد کی کلاسوں میں تین سال مسلسل اس معیار کو قائم رکھتے ہیں تو ادارہ ایسے نمایاں طلباء کو اپنی شهادة الثانوية الخاصة (ثانویہ خاصہ کی خاص سند) عطا کرتا ہے، جو کہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اس سال دو دفعہ کلیہ کلاسز کے طلبہ کو رئیس الجامعہ ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کی ہدایت پر یہ سند پیش کی گئی۔ آغاز سال میں کل ۳۲ طلبہ نے اور حالیہ ششماہی رزلٹ تقریب میں ۲۲ نمایاں طلبہ نے یہ خصوصی سند حاصل کی۔ الحمدللہ

جامعہ کی انتظامیہ نے سال بھر تدریسی ذمہ داریوں کی باقاعدہ ادائیگی اور مثالی حاضری کا مظاہرہ کرنے والے اساتذۂ کرام کو خصوصی اعزازات سے بھی نوازا۔ اس موقع پر ناظم دفتر قاری خالد فاروق، شیخ الحدیث مولانا عبد الرشید تونسوی اور مولانا محمد اسحاق طاہر کی علمی خدمات اور تدریسی پابندی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

اس موقعہ پر جامعہ کی جانب سے گراں قدر مالی انعامات کے ساتھ "مقابلۂ حفظِ حدیث" کا بھی اعلان کیا گیا۔ اس علمی مقابلہ کا مقصد طلبہ میں احادیثِ نبویہ کے حفظ، فہم اور مطالعہ کے ذوق کو فروغ دینا ہے۔

تقریب میں شریک ممتاز شخصیات میں رئیس الجامعہ کے برادر اصغر مولانا حافظ عبد الوحید روپڑی حفظہ اللہ (شریک بانی جامعہ لاہور الاسلامیہ)، شیخ الحدیث مولانا محمد رمضان سلفی، شیخ الحدیث مولانا محمد شفیق مدنی،

شیخ الحدیث مولانا زید احمد، شیخ الحدیث مولانا عبد الرشید تونسوی، حاجی محمد اسلام، شیخ محمد ادریس اسحاق، شیخ محمد عرفان، ڈاکٹر حافظ حسین ازہر، ڈاکٹر حافظ انس نضر، حافظ عبد العلیم روپڑی، شیخ محمد خالد اور خالد پرویز حفظہم اللہ سمیت جامعہ کے سینئر اساتذۂ کرام ورفقاء شامل تھے۔

۲. مصاحفِ محدث — علمِ قراءات کی خدمت میں ایک منفرد علمی و تکنیکی پیش رفت

قرآنِ کریم کی کتابت، ضبط، قراءات اور رسمِ عثمانی کے حوالے سے امتِ مسلمہ نے ہر دور میں گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہیں۔ محدثین، مفسرین، قراء اور ائمۂ فن نے صدیوں پر محیط محنت کے نتیجے میں قراءاتِ متواترہ کے اس عظیم علمی ورثے کو محفوظ رکھا اور اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔ عصرِ حاضر میں، جب علمی ذخائر کو ڈیجیٹل ذرائع سے محفوظ اور عام کرنے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے، ایسے میں قراءاتِ قرآنیہ کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرنا ایک اہم علمی ضرورت بن چکا تھا۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر جامعہ لاہور الاسلامیہ کے کلیۃ القرآن الکریم نے کچھ عرصہ قبل ۱۶ سال پر مشتمل طویل جدوجہد کے بعد علمی منصوبے کی تکمیل کی ہے، جس کے نتیجے میں قراءات عشرہ صغری پر مشتمل بیس مصاحف کو "مصاحفِ محدث" کے عنوان سے ایک جامع اور جدید ڈیجیٹل فورم میں پیش کیا گیا ہے، جس سے اس فن کے طلبہ، اساتذہ، قراء، محققین اور عام شائقینِ قرآن یکساں طور پر مستفید ہو سکیں گے۔

اس منصوبے کی تیاری میں علمی صحت، فنی معیار اور صارف کی سہولت کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ ہر روایت کے مطابق مکمل مصحف کی قراءت، آڈیو تلاوت، آیات کی تلاش، سورتوں اور آیات کی منظم فہرست، تلاوت کے ساتھ آیات کی خودکار تظلیل (Highlighting) اور کمپیوٹر و موبائل دونوں پر یکساں مؤثر انداز میں استفادے کی سہولت، اس منصوبے کو اپنے نوعیت کا ایک ممتاز قرآنی ذخیرہ بناتی ہے۔ اس کے ذریعے مختلف قراءات کا تقابلی مطالعہ، تدریس اور انفرادی استفادہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سہل ہو گیا ہے۔

یہ علمی منصوبہ تین اداروں کے باہمی تعاون کا حسین مظہر ہے۔ 'کلیۃ القرآن الکریم، جامعہ لاہور الاسلامیہ' نے مصاحف کی تیاری، علمی مراجعت، تصحیح اور تدقیق کی ذمہ داری انجام دی، تاکہ ہر متن قراءاتِ متواترہ کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق پیش کیا جا سکے۔ 'النور سنٹر (محدث میڈیا)' نے ویب ڈیجیٹل پروگرام کی تیاری، پروگرامنگ، تکنیکی ڈھانچے اور صارف دوست نظام کی تشکیل کی ذمہ داری سنبھالی، جبکہ کویت کے عالمی ادارے 'مؤسسة روح المسك للإنتاج الفني' نے اس منصوبے کے لیے مالی معاونت فراہم کی۔

توقع ہے کہ یہ ڈیجیٹل پروگرام نہ صرف پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کے جامعات، مدارس، مراکزِ قراءات،

تحقیقی اداروں اور انفرادی اہلِ علم کے لیے ایک مستند علمی مرجع ثابت ہوگا۔ بالخصوص وہ طلبہ و محققین جو مختلف قراءات کے نصوص، رسمِ مصحف اور ادائیگی کے فرق کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس منصوبے سے وابستہ تمام علماء، قراء، محققین، فنی ماہرین، معاونین اور مخیر حضرات کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔

۳. مدینہ یونیورسٹی میں طلبہ کے داخلے — جامعہ کی علمی روایت کا روشن تسلسل

جامعہ لاہور الاسلامیہ کی علمی شناخت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے طلبہ کو اسلامی تعلیم کے عالمی ادارے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور عالمِ اسلام کی دیگر ممتاز جامعات اپنے یہاں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سکالرشپ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رواں سال بھی جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ)، مرکز البیت العتیق کے ۱۶ ممتاز طلبہ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

حافظ علی زیب ذہبی	حافظ محمد عمر	حافظ محمد ثاقب	حافظ شہریار
حافظ ثناء اللہ فاروقی	حافظ محمد فیصل	حافظ عبد اللہ	حافظ عبد الحنان
حافظ محمد عبد اللطیف	حافظ راشد علی	حافظ سلمان مدنی	حافظ عبد الرؤف
حافظ حویرث فاروق	حافظ محمد اسماعیل	حافظ گلزیب الرحمن	

اسی طرح کلیۃ القرآن للبنات کی ایک طالبہ 'مقدس غفار' کا داخلہ طیبہ یونیورسٹی، مدینہ میں کنفرم ہوا۔

جامعہ لاہور الاسلامیہ کے طلبہ کا بین الاقوامی معیار کے حامل ادارے میں داخلہ محض ایک تعلیمی مرحلہ نہیں، بلکہ علمی استعداد، دینی فہم اور تحقیقی صلاحیتوں کے اعتراف کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ والحمد للہ

۴. طلبہ کے ماہانہ وظائف — علمی حوصلہ افزائی کی ایک مؤثر روایت

تعلیم و تربیت کے میدان میں باصلاحیت اور محنتی طلبہ کی حوصلہ افزائی کسی بھی معیاری تعلیمی ادارے کی بنیادی ذمہ داری شمار ہوتی ہے۔ اسی احساسِ ذمہ داری کے پیشِ نظر جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ) میں اپنے قیام کے ابتدائی دور ہی سے نمایاں علمی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ و طالبات کے لیے ماہانہ وظائف کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا۔ اس مبارک روایت کا بنیادی مقصد ذہین اور محنتی طلبہ کی علمی سرپرستی، تعلیمی مسابقت کو فروغ دینا اور انہیں مزید محنت و استقامت کی ترغیب دینا ہے۔

اس وقت جامعہ میں پچاس کے قریب طلبہ و طالبات ایسے ہیں جو اپنے شش ماہی یا سالانہ امتحانات میں ۹۰ فیصد یا اس سے زائد نمبر حاصل کرنے کی بنیاد پر ماہانہ وظیفہ حاصل کر رہے ہیں۔ ہر کامیاب طالبِ علم کو ماہانہ

ایک ہزار روپے بطورِ وظیفہ دیے جاتے ہیں۔ ہر امتحان کے بعد نتائج کی روشنی میں میرٹ از سرِ نو مرتب کیا جاتا ہے۔ اس سے طلبہ میں مستقل مزاجی، محنت اور اعلیٰ تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

یہ وظائف علمی امتیاز کے اعتراف اور طلبہ کی مسلسل حوصلہ افزائی کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔

۵. البیت العتیق کیمپس میں چار سالہ بی ایس اسلامک اسٹڈیز پروگرام کی منظوری

لاہور انسٹیٹیوٹ فار سوشل سائنسز (LISS) ، ۹۱ بابر بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں چار سالہ BS Islamic Studies پروگرام کی کامیابی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تسلسل کے بعد اب بیت العتیق کیمپس میں بھی الحمدللہ الگ سے چار سالہ BS Islamic Studies پروگرام کی باقاعدہ منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔ اس طرح طلبہ کو اب بیت العتیق کیمپس میں بھی وہی تعلیمی پروگرام میسر ہوگا، جو قبل ازیں ۹۱ بابر بلاک گارڈن ٹاؤن میں کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

بیت العتیق کیمپس میں اس پروگرام کا آغاز دراصل شیخ الجامعہ ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ کے اس وژن کی توسیع ہے جس کے تحت دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے عصری شہادات تک رسائی کو آسان بنانا اور انہیں ایک منظم تعلیمی ماحول میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرنا مقصود ہے۔

٦. صحت مند تفریح اور تربیتی سرگرمیاں

تعلیمی اداروں کی کامیابی کا انحصار نصابی سرگرمیوں تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ طلبہ کی ذہنی آسودگی، جسمانی صحت، باہمی روابط اور مثبت شخصیت کی تعمیر کے لیے غیر نصابی اور تربیتی سرگرمیوں کا بھی بنیادی کردار ہوتا ہے۔ یہی سرگرمیاں تعلیمی ماحول کو مزید متوازن، فعال اور خوشگوار بناتی ہیں، جس کے نتیجے میں طلبہ تازہ عزم اور یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیمی ذمہ داریوں پر متوجہ ہوتے ہیں۔

اسی تصور کے پیشِ نظر جامعہ لاہور الاسلامیہ، مرکز البیت العتیق کی انتظامیہ نے تین ماہ قبل شدید گرمی کے موسم میں طلبہ کے لیے ایک روزہ تفریحی وتربیتی پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس مقصد کے لیے علاقے کے معروف "پیراڈائز سوئمنگ پول" کو متعلقین جامعہ کے لیے مخصوص کیا گیا، تاکہ طلبہ ایک محفوظ، منظم اور پُرسکون ماحول میں اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

جامعہ سے طلبہ کی آمد ورفت کے لیے کشادہ اور آرام دہ گاڑیوں کا انتظام کیا گیا۔ صبح تقریباً نو بجے اساتذۂ کرام کی نگرانی میں تمام طلبہ روانہ ہوئے اور شام پانچ بجے تک سوئمنگ پول کی مکمل بکنگ جامعہ کے لیے مخصوص رہی۔ اس دوران طلبہ نے نہایت خوشگوار، منظم اور پُرکیف ماحول میں دن گزارا۔

پروگرام کے شرکاء کے لیے عمدہ ضیافت کا بھی خصوصی اہتمام کیا گیا۔ دوپہر کے وقت طلبہ کو لذیذ بریانی اور تازہ آم پیش کیے گئے، جبکہ اساتذۂ کرام کے لیے مٹن قورمہ اور دیگر لوازمات پر مشتمل پُر تکلف ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ اس باوقار میزبانی نے پروگرام کی خوشگوار یادوں کو مزید دلنشیں بنادیا۔

۷. کلیۃ القرآن الکریم آن لائن اور آن سائٹ — تعلیمِ قرآن کی ہمہ گیر علمی تحریک

پاکستان میں خواتین کے لیے دینی تعلیم کے متعدد ادارے مختلف مختصر اور طویل المدت کورسز پیش کر رہے ہیں، تاہم مکمل درس نظامی کے لیے سرگرم ادارے نسبتاً کم ہیں۔ جامعہ لاہور الاسلامیہ، رحمانیہ نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ۲۰۱۶ء میں 'البیت العتیق کیمپس' میں کلیۃ القرآن الکریم للبنات کا باقاعدہ آغاز کیا، جس میں 'وفاق المدارس السلفیہ' کے مطابق سات سالہ درس نظامی + قراءات سبعہ وعشرہ کا مکمل نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اس وقت تقریباً تین سو طالبات ادارے میں زیرِ تعلیم ہیں اور مستند معلمات وشیوخ کی زیر نگرانی قرآن وسنت کے علوم سے بہرہ ور ہو رہی ہیں۔ طالبات روزانہ آٹھ گھنٹے دینی تعلیم میں صرف کرتی ہیں، علاوہ ازیں لازمی عصری تعلیم بھی جاری رکھتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کلیہ میں زیرِ تعلیم طالبات نے میٹرک کے حالیہ امتحانات ۲۰۲۶ میں سو صد فیصد کامیابی حاصل کی ہے، الحمدللہ۔

اسی طرح ۲۰۱۹ء میں کلیۃ القرآن الکریم آن لائن کا آغاز کیا گیا، جس نے مختصر عرصے میں غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس میں خواتین کے لیے آن لائن میں حفظِ قرآن، ناظرہ، تجوید، قراءات، درسِ نظامی، ترجمۂ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر دینی علوم کے باقاعدہ شعبہ جات قائم ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی، منظم انتظامی نظام، باقاعدہ امتحانات، حاضری کے مربوط نظام، تدریسی نگرانی اور معیاری نصاب نے اس ادارے کو خواتین کی دینی تعلیم کے میدان میں ایک مؤثر علمی مرکز کی حیثیت عطا کی ہے۔

اس پلیٹ فارم کے ذریعے پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر، عمان، بحرین، کویت، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں مقیم تین ہزار کے قریب طالبات مستند معلمات اور قومی وبین الاقوامی مشائخ سے براہِ راست تعلیم حاصل کر رہی ہیں، الحمدللہ علی ذلک

اس ادارے کی سرپرستی اور علمی رہنمائی ملک کے ممتاز اہلِ علم و قراء حضرات فرما رہے ہیں، جن میں:

فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی حفظہ اللہ	فضیلۃ الشیخ حافظ عبد الوحید روپڑی حفظہ اللہ
استاذ القراء قاری محمد ابراہیم میر محمدی حفظہ اللہ	استاذ القراء ڈاکٹر قاری حمزہ مدنی حفظہ اللہ

شامل ہیں، جبکہ انتظامی وتدریسی امور درج ذیل ذمہ داران کی نگرانی میں انجام پا رہے ہیں:

قاری ظہیر ادریس	باجی عائشہ مدنی	قاریہ حمیر اطارق
قاریہ نائلہ امین	قاریہ خدیجۃ الکبریٰ	قاریہ فرحت منظور

یہ ادارہ آن لائن کے ذریعے نئی نسل کو قرآنِ کریم سے تعلق مضبوط کرنے میں مؤثر کردار ادا کر رہا ہے۔

۸. 'تحفظِ حرمین شریفین اور دینی جماعتوں کا کردار': جامعہ میں منعقدہ عظیم الشان سیمینار

حرمین شریفین کا تقدس اور تحفظ ہر مسلمان کے ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ اسی عظیم مقصد کی خاطر اور عوام الناس میں شعور بیدار کرنے کے لیے بروز جمعرات ۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۶ء کو **قرآن وسنہ موومنٹ، پاکستان** کے زیرِ اہتمام **جامعہ لاہور الاسلامیہ، مرکز البیت العتیق** میں ایک پروقار اور عظیم الشان سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریبِ سعید میں مختلف دینی جماعتوں کے قائدین، جید علمائے کرام، شیوخ الحدیث، جامعات کے مدیران اور کثیر تعداد میں طلباء نے شرکت کی۔ تقریب کو دو نشستوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس کی روئیداد درج ذیل ہے:

پہلی نشست: فکری بیداری اور علمی تربیت

سیمینار کا باقاعدہ آغاز قاری مدثر عزیزی کی مسحور کن تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جس کے بعد محترم ارشد سلیمان نے رسالت مآب ﷺ کی عقیدت میں ڈوبے ہوئے چند اشعار پیش کیے۔

شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ (سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ، فیصل آباد) نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ

"اسلام کا بنیادی پیغام توحید، شرک سے اجتناب اور اللہ کی بندگی ہے اور بیت اللہ کی حرمت و تعظیم اور مقدس مقامات کا احترام ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ امت کی حقیقی رہنمائی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس اور آپ کی سنت کے ذریعے ہوتی ہے؛ اس لیے قرآن کو سمجھ کر اس پر عمل، سنت کی پیروی اور تزکیۂ نفس ہی کامیابی کا راستہ ہے۔"

شیخ الحدیث مولانا محمد رمضان سلفی حفظہ اللہ (سابق شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ) نے فرمایا کہ

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال قبل مکہ مکرمہ میں توحید کا پہلا مرکز تعمیر کیا۔ اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود آج وہاں لاکھوں زائرین کی آمد اللہ کے وعدے کی سچائی ہے۔ انہوں نے حرمین کے دفاع کے لیے پاکستان، ترکیہ اور سعودی عرب کے اتحاد کو مثبت پہلو قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ تمام مسلمانوں اور اہل علم کو حرمین شریفین کی ناموس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

شیخ الحدیث مولانا مفتی شفیق مدنی حفظہ اللہ (مدیر مرکز ابن مسعود، لاہور) نے فرمایا کہ

"علم اللہ کی نازل کردہ ایک عظیم نعمت اور انبیاء کی وراثت ہے۔ اس کے حصول کے لیے اخلاص اور

دل کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے۔ علم جسمانی راحت سے نہیں بلکہ مشقتوں سے حاصل ہوتا ہے۔"

شیخ الحدیث مولانا عبد الرشید تونسوی حفظہ اللہ (نائب شیخ الحدیث جامعہ لاہور الاسلامیہ) نے فرمایا کہ
"حرمین شریفین دینِ اسلام اور نزولِ وحی کا مرکز ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

إِنَّ الْإِيمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلَى جُحْرِهَا[1].

"بلاشبہ ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ کر آجائے گا جیسے سانپ سمٹ کر اپنے بل میں آجاتا ہے۔"
حرمین کی حفاظت ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہے، مسلم ممالک کو چاہیے کہ ایسے افراد تیار کریں جن کی موجودگی میں کوئی فسادی حرمین کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔"

قاری سید محمد علی ہاشمی حفظہ اللہ (مدیر جامعہ بلال یو کے سنٹر، لاہور) نے کہا کہ
"حرمین سے ہمارا تعلق ایمان، محبت، تاریخ اور ہماری شناخت کا تعلق ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والا مسلمان قلبی طور پر حرمین سے وابستہ ہے۔ چودہ صدیوں سے صحابہ کرام، محدثین اور ائمہ علم و تزکیہ نے اس نسبت کو اپنے علم، عمل اور محبت سے زندہ رکھا۔ حضرت عمرؓ دعا کرتے تھے:

اللَّهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ، وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ[2].

"اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت عطا کر اور میری موت اپنے رسول کے شہر میں مقدر کر دے۔"
حرم سے تعلق ہماری زندگی اور بقا کی علامت ہے؛ لہٰذا اگر امت کو اپنی قوت، وحدت اور مقصد دوبارہ حاصل کرنا ہے تو اسے اپنی اصل نسبت کی طرف لوٹنا ہوگا۔"

دوسری نشست: عملی اقدامات، عزمِ دفاع اور اتحادِ امت

'تحفظ حرمین شریفین سیمینار' کی دوسری نشست کا آغاز **ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی حفظہ اللہ (پرنسپل کلیۃ القرآن الکریم، لاہور)** کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد **مولانا حافظ عبد الوحید روپڑی حفظہ اللہ (شریک بانی جامعہ رحمانیہ)** نے تحفظ حرمین شریفین کے حوالے سے اپنا صدارتی خطبہ سے پیش کیا۔

اس سیمینار میں درج ذیل نمائندہ قائدین، مدیران جامعات اور شیوخ الحدیث نے شرکت فرمائی:

مولانا حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ	مولانا محمد رمضان سلفی حفظہ اللہ	مولانا مفتی محمد شفیق مدنی حفظہ اللہ
علامہ ابتسام الٰہی ظہیر حفظہ اللہ	علامہ ہشام الٰہی ظہیر حفظہ اللہ	چوہدری محمد یسین ظفر حفظہ اللہ

---

۱ صحیح بخاری: ۱۸۷۶

۲ صحیح بخاری: ۱۸۹۰

حافظ عبد الغفار روپڑی حفظہ اللہ	مولانا امیر حمزہ حفظہ اللہ	علامہ زبیر ظہیر حفظہ اللہ
ڈاکٹر نصیر احمد اختر حفظہ اللہ	مولانا زید احمد حفظہ اللہ	مولانا عبد الرشید تونسوی حفظہ اللہ
ڈاکٹر مطیع اللہ باجوہ حفظہ اللہ	ڈاکٹر حافظ حسین ازہر حفظہ اللہ	ڈاکٹر حافظ انس نضر حفظہ اللہ
حافظ غضنفر عزیز حفظہ اللہ	ڈاکٹر حافظ ابو بکر صدیق حفظہ اللہ	مولانا عتیق الرحمن علوی حفظہ اللہ
ڈاکٹر منیر احمد وقار حفظہ اللہ	قاری سید محمد علی ہاشمی حفظہ اللہ	ڈاکٹر شفیق الرحمن زاہد حفظہ اللہ
ڈاکٹر مرزا عمران حیدر حفظہ اللہ	ڈاکٹر حافظ شاکر محمود حفظہ اللہ	ڈاکٹر عبد الماجد سلفی حفظہ اللہ
ڈاکٹر ارشاد الحسن ابرار حفظہ اللہ	ڈاکٹر فہد اللہ مراد حفظہ اللہ	ڈاکٹر صلاح الدین حفظہ اللہ
ڈاکٹر قاری نعمان مختار لکھوی حفظہ اللہ	حافظ نعیم الرحمن ناصف حفظہ اللہ	حافظ عبد الرحمن عزیز حفظہ اللہ

دفاع حرمین شریفین سیمینار کو روزنامہ جنگ، جیو نیوز، دنیا نیوز، نوائے وقت، روزنامہ پاکستان، روزنامہ اوصاف، جہان پاکستان، اردو پوائنٹ، لاہور رنگ سمیت قومی اخبارات، ٹی وی چینلز (جیو نیوز، سماٹی وی، لاہور نیوز وغیرہ) اور ڈیجیٹل میڈیا نے نمایاں کوریج دی۔ دینی حلقوں کی کسی علمی وفکری سرگرمی کو مین اسٹریم میڈیا پر اس وسعت کے ساتھ جگہ ملنا یقیناً ایک خوش آئند اور حوصلہ افزا امر ہے۔

یہ سیمینار اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ پاکستان کی دینی قیادت اور عوام حرمین شریفین کے دفاع کے لیے ایک جان اور ایک آواز ہیں اور ضرورت پڑنے پر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔[1]

۹. اعزازات (شیلڈز) کی تقسیم

دورانِ تقریب انجینئر علامہ حافظ ابتسام الٰہی ظہیر اور علامہ حافظ ہشام الٰہی ظہیر کو ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی تکمیل پر قائدین، شیوخ الحدیث اور سینئر علماء کے ہاتھوں اعزازی شیلڈز پیش کی گئیں۔

اسی طرح 'جامعہ لاہور الاسلامیہ' کے ہونہار سپوت فضیلۃ الشیخ قاری صہیب احمد میر محمدی حفظہ اللہ کو حال ہی میں ملک کی ممتاز سرکاری جامعہ Government College University Lahore کی جانب سے ان کی دینی اور رفاہی خدمات کے اعتراف میں (PhD) کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس علمی اعزاز پر مادرِ علمی اور ان کے اساتذہ کی جانب سے خصوصی شیلڈ پیش کی گئی، جو ان کے نمائندے نے وصول کی۔

اس موقع پر ان ۱۶ خوش نصیب طلباء کو بھی علمائے کرام کے دستِ مبارک سے خصوصی شیلڈز سے نوازا گیا، جن کا داخلہ مدینہ یونیورسٹی میں ہوا تھا۔

---

۱ 'تحفظ حرمین شریفین سیمینار' میں پیش کردہ مختلف خطابات کا خلاصہ ادارتی مضمون میں شامل اشاعت ہے۔

ایک اور حدی خواں اُٹھ گیا

(حافظ محمد ادریس رحمہ اللہ کے سوانح حیات)

ڈاکٹر حافظ فہد اللہ مراد

تحریک اسلامی کا وہ قافلہ جو ہندوپاک کے بیابانوں سے اُٹھا اور پوری دنیا کو اپنا اسیر کر گیا، اب اپنے قابل رشک فرزندوں سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ امیر العظیم رحمہ اللہ کا داغِ مفارقت کا زخم ابھی تازہ ہی تھا کہ ستمبر کے اکیسویں روز سیدِ مودودی کا ایک اور لاڈلا نماز بندگی کی تکمیل کے دوران ہی متاع جسم و جان سمیت حضور حق میں پہنچ گیا۔ اس دراز قد، روشن چہرے اور سفید ریش چاک و چوبند بزرگ کا اسم گرامی حافظ محمد ادریس تھا۔ لفظِ حافظ ان کے خاندانی نام کے ساتھ اس طرح جڑا کہ اس کے بغیر اس شخصیت کی پہچان ہی ممکن نہ رہی۔ قرآن کے ساتھ یہ تعلق بچپن سے ہی اس قدر والہانہ تھا کہ جب تک اسے لوحِ قلب پر نقش نہ کر لیا بے سکون رہا اور سفر محبت کی یہ پہلی منزل اس طرح طے کی کہ زندگی کا حوالہ بن گئی۔ اس کے بعد زندگی بھر قرآن سے وابستگی ہی ان کا سب سے بڑا تحریکی تعارف بنا۔

یہ خوش نصیب شخص گجرات کے ایک مذہبی گھرانے میں ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں حفظ قرآن کی ابتدائی تعلیم سے فراغت پاکر عصری تعلیم کی طرف راغب ہوئے تو اپنی بے پناہ ذہانت کی بدولت بورڈ کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے سلور میڈل کے مستحق قرار پائے اور بہ طور انعام تعلیمی وظیفے سے نوازے گئے۔ یہ ۱۹۶۳ء کا سن تھا؛ یہی وہ سال ہے جس میں یہ فیصلہ کیا کہ ان ذہانتوں کے صرف کرنے کی بہترین جگہ دین کی دعوت اور اس زمین پر اس کے کلمے کی سربلندی ہے لہٰذا وہ 'اسلامی جمعیت طلبہ' میں شامل ہو گئے۔ ان کی ذہانت، اخلاص اور غلبہ حق کے لیے کی جانے والی بے پناہ محنت نے بہت جلد انھیں اس قافلے کے سالاروں میں شامل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور آتے ہی جمعیت لاہور کے ناظم کے ساتھ ساتھ جمعیت کی مرکزی شوریٰ کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء تک اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی ادا کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ کامل محنت سے تعلیمی جستجو بھی جاری رہی اور اسی برس گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیازی درجے میں گریجویشن کی تکمیل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

جناب حافظ ادریس بدوِ شعور ہی سے یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کی زندگی کا مطمع نگاہ اور صلاحیتوں کا تنہا مصرف غلبۂ دین کی کاوشیں ہیں، اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے دیگر بہت سارے امکانات کو مسترد کر کے علوم دینیہ اور عربیہ کی تعلیم کے لیے خود کو وقف کر دیا اور پنجاب یونی ورسٹی میں ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا۔ ستر کی دہائی میں پنجاب یونی ورسٹی اور ینٹل کالج جن اساتذہ کے دم سے آباد تھا، ان میں عالم اسلام کے بہت بڑے محقق علما شامل تھے جن میں سرفہرست حضرت علامہ سید العجم والعرب فی اللغہ والأدب مولانا عبدالعزیز میمن تھے۔ ان کے علاوہ برِ عظیم کے نامور محقق، ادیب اور اُستاد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، صوفی ضیاء الحق، پروفیسر عبدالقیوم اور نوجوان عربی دان ڈاکٹر ظہور احمد اظہر شامل تھے۔ یہ ایسا ماحول تھا کہ ہر طرف علم وادب کی نہریں رواں تھیں جس سے مستفید ہونے کے لیے حافظ محمد ادریس نے خود کو وقف کیا ہوا تھا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو تحریکی وابستگی بھی عروج پر تھی۔

ادھر مشرقی پاکستان میں جمعیت کے قائدین پر تشدد شروع ہوا اور اسی دوران عبدالمالک شہید کی شہادت کا حادثہ پیش آگیا جس پر حافظ محمد ادریس نے سٹوڈنٹ قائد کے طور پر ایک احتجاج کے دوران حکومت مخالف تقریر کی اور مارشل لا کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ ایامِ اسیری نے اتنی طوالت کھینچی کہ اسی دوران ایم اے عربی کے امتحانات کا وقت آن پہنچا۔ جیل ہی سے امتحان میں شمولیت اختیار کی اور اس قدر نمبر حاصل کیے کہ یونی ورسٹی کی جانب سے گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ عربی کی تعلیم سے فراغت کے بعد پنجاب یونی ورسٹی میں ہی ایم اے اسلامیات میں داخلہ لیا اور علامہ علاؤالدین صدیقی، پروفیسر حافظ احمد یار، ڈاکٹر ملک محمد اسلم اور ڈاکٹر جمیلہ شوکت جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ اسی دوران پنجاب یونی ورسٹی طلبہ یونین کے انتخابات آگئے اور آپ یونی ورسٹی کے صدر کے لیے جمعیت کی طرف سے نام زد کیے گئے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے تمام سیکولر اور کمیونسٹ طلبہ قوتوں کو شکستِ فاش سے دوچار کیا اور پنجاب یونی ورسٹی طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۷۱ء میں ایم اے اسلامیات کی تکمیل کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا اور ساتھ ہی طلبہ سیاست کو بھی خیرباد کہہ دیا اور ۱۹۷۱ء میں ہی جماعت اسلامی کی رکنیت کا حلف اُٹھا کر آیندہ زندگی اسی دعوت کے لیے وقف کر دی۔ آپ کی تحریری کاوشوں کا آغاز تو زمانۂ اسیری میں ہو چکا تھا جو بعد میں ”روشنی کے مینار“ اور ”رحمان کے سائے میں“ کے نام سے طبع ہوا۔

اسی ذوق کی بنا پر جماعت کے نظم میں آتے ہی تحقیق وتصنیف کا سلسلہ شروع ہوگیا اور سید مودودیؒ کے ایما پر تفہیم القرآن کا موضوعاتی اشاریہ مرتب کیا جسے مولانا نے بے پناہ پسند فرمایا۔ آپ کی انھی علمی صلاحیتوں اور عربی، انگریزی زبانوں کے ساتھ گہرے شغف کی بنیاد پر سید مودودیؒ نے آپ کو تحریک کی عالمی دعوت کے لیے منتخب کیا اور افریقہ بھیج دیا، جہاں قریباً بارہ برس تک آپ اسلامک فاؤنڈیشن، کینیا کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے دعوتی اور انتظامی خدمات انجام دیتے رہے۔ افریقہ میں آپ کے دعوتی کاموں کا دائرہ خاصا وسیع رہا ہے۔ معروف انگریزی مجلے "الاسلام" کے ادارتی بورڈ کے ممبر رہے، جہاں سے تحریری کام انجام پاتا تھا اس کے ساتھ دعوتی وفود، قرآن کلاسز اور لٹریچر کے حلقات میں بھی سرگرم رہتے تھے۔ اللہ نے آپ کو یہ اعزاز بخشا کہ کئی غیر مسلم آپ کے ہاتھ پر کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں دوبارہ پاکستان منتقل ہوئے اور جماعت کے ڈپٹی جنرل سیکرٹری مقرر کردیے گئے۔ بعد ازاں لمبے عرصے تک صوبہ پنجاب میں نظامت کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ آپ نے جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر کے طور پر تقریباً آٹھ برس گزارے؛ ملک کے طول وعرض میں ہر وقت دعوتی اور تنظیمی امور میں مصروف رہتے۔ ان اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ کا رشتہ قلم وقرطاس سے کبھی نہیں ٹوٹا۔ لہٰذا جب دعوتی اور تنظیمی امور سے فراغت پاکر منصورہ لوٹتے تو گھر نہیں بیٹھتے تھے بل کہ جماعت کے تصنیفی اور تحقیقی "ادارۂ معارف اسلامی" میں مسند نشین ہوجاتے اور زبانِ قلم سے دعوت کا آغاز کردیتے۔ آپ نے تقریباً چودہ برس تک ادارۂ معارف اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ جہاں بیٹھ کر کئی تصنیفات اور دعوتی کتابچے نذر قارئین کیے۔ راقم جب کبھی ادارۂ معارف اسلامی کی لائبریری سے استفادے کے لیے منصورہ جاتا تو حضرت حافظ صاحب کو وہاں موجود پاتا۔ یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ حضرت حافظ محمد ادریس صاحب کا بنیادی مزاج دعوتی تھا، اس لیے آپ کے تحریری سرمایے پر بھی علمی کی بجائے دعوتی رنگ غالب ہے۔ آپ تحریر کو دعوت کا ذریعہ سمجھتے تھے، اس کے لیے آپ ہر سطح کے قارئین کے لیے لکھتے۔ آپ کے تخلیق کردہ ادب کا ایک حصہ نونہالانِ اُمت اور نوجوانانِ ملت کے گرد گھومتا ہے؛ گویا کہ اُمت کی تعلیم وتربیت کے لیے آپ اپنی بلند تر علمی سطح کو بھی قربان کردیتے تھے۔ یہاں پر ہم اپنی ایک طالب علمانہ شکایت کیے دیتے ہیں کہ لمبے عرصے تک ادارۂ معارف اسلامی کی سربراہی کے باوصف اپنی تنظیمی اور دعوتی مصروفیات کے سبب ادارے میں بہت قابل قدر علمی کام نہیں کرواسکے خصوصاً سید مودودیؒ کی وفات کے بعد جو علمی اور تصنیفی خلا پیدا ہوگیا تھا اور جماعت کو مسلسل

علمی رہ نمائی کی بھی ضرورت تھی، اس کی بنیادی ذمہ داری ادارۂ معارف اسلامی کی ہی تھی۔ پھر نائن الیون کے بعد پاکستان میں خصوصاً اور عالم اسلام میں عموماً ایک تہذیبی شفٹ بہت تیزی سے آیا۔ اس میں سب سے زیادہ جس طبقۂ اہل علم سے علمی اور تہذیبی رہ نمائی کا تقاضا کیا جاسکتا تھا، وہ جماعت اسلامی اور اس کا تصنیفی و علمی مرکز ادارۂ معارف اسلامی ہی تھا لیکن یہ نہ ہوسکا؛ اگر ایسا ہو جاتا تو اُمت کی طرف سے ایک فرض کی ادائیگی بھی ہوتی، تحریک اسلامی کو نئی زندگی اور روشنی بھی میسر آتی اور یہ آپ کی حسنات کا بہت بڑا حصہ ہوتا۔

آپ کی دعوتی زندگی کا مرکز زیادہ تر قرآن کریم رہا۔ اس لیے جماعت میں آپ کے دروس قرآن، تفسیر قرآن اور خلاصۂ مضامین قرآن کا شہرہ تھا۔ عام طور پر اجتماعات اور تربیت گاہوں میں درس قرآن کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد ہوتی۔ ایسے ہی رمضان المبارک میں نماز تراویح کے بعد جامع مسجد منصورہ میں سالہا سال تک آپ مضامین قرآن کا خلاصہ بیان کرتے رہے۔ ہم بارگاہِ الٰہی میں التجا کرتے ہیں کہ قرآن کریم آخرت میں آپ کے لیے انیس و غم خوار بن جائے۔

آپ نے صدقۂ جاریہ کے طور پر جہاں ہزاروں کارکنان کی تربیت کی ہے، وہاں ستر کے قریب کتابیں بھی آپ کے لیے مایۂ آخرت ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر آپ کی وہ نیک اولاد ہے کہ جنھیں آپ اپنی زندگی میں ہی تحریک اسلامی کے کاموں میں لگا گئے تھے۔ جن میں ایک بڑے بیٹے جناب داؤد ادریس اس وقت تنظیم جماعت پنجاب میں ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر حافظ ہارون ادریس جو جواں عمری میں ہی خدا کے حضور پیش ہوگئے اور اپنے بوڑھے باپ کو ہمیشہ کے لیے اُداس کرگئے، جن کی یادوں کی تھکن ہر وقت حافظ صاحب کی شخصیت پر بکھری رہتی تھی اور شاید انھی کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے لیے آپ بھی ان کے پاس سدھار گئے ہیں۔ ایسے ہی فریحہ داؤد اور نواسے محتشم لبیب بھی آپ کی یادوں کا گلشن ہیں لیکن آپ کی اور تحریک اسلامی کی آیندہ تمناؤں کا مرکز آپ کے جاں نثار پوتے حافظ طلحہ ادریس ہیں جن سے ہمیں بھی اور خود حافظ صاحب مرحوم کو بھی بے پناہ اُمیدیں تھیں۔ احساس یہ ہوتا تھا کہ وہ عمر بھر کا تحریکی تجربہ اور اپنی ساری تمنائیں اِن کے سپرد کرکے، اپنے بعد ساری تحریکی ذمہ داریاں انھیں منتقل کرکے اپنے حقیقی گھر سدھار گئے ہیں۔

اللہ کریم پورے خاندان کو اس صدمے کو سہنے کے قابل کردے اور حضرت حافظ صاحب کو اعلیٰ علیین میں ان کے رفقا اور محبوبوں کے گروہ میں شامل فرمائے؛ آمین!

وفیات

تذکرۂ مولانا محمد یحییٰ جلال پوری رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹۴۰ء۔۲۰۲۶ء)

مولانا زکریا رفیق

مولانا محمد یحییٰ بن مولانا سلطان محمود محدث جلال پوریؒ ۱۹۴۰ء میں جلال پور پیر والا، ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جنوبی پنجاب کے معروف محدث، مدرس اور اہل حدیث عالم تھے، جنھوں نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۹۵ء کا طویل عرصہ تدریسِ حدیث کی خدمت انجام دی۔ مولانا سلطان محمود جلال پوریؒ کے نمایاں اساتذہ میں مولانا عبد الحق محدث الہاشمیؒ مہاجر مکی کا شمار ہوتا ہے۔

مولانا محمد یحییٰؒ کی والدہ عائشہ مشہور 'مقدمہ بہاولپور' کی مدعیہ تھیں، متعدد دیوبندی اور اہل حدیث علماء نے عدالتی بحث میں حصہ لیا۔ بالآخر ہندوستان میں پہلی مرتبہ قانونی طور پر قادیانیوں کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ اسی بنیاد پر عائشہ بی بی کا نکاح فسخ ہوا، پھر مولانا سلطان محمود سے ان کا عقد ثانی ہوا۔ محمد یحییٰ ابھی اڑھائی برس کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے عصری تعلیم سرکاری اداروں سے حاصل کی، جب کہ دینی علوم، صحاحِ ستہ اور مدارس کی نصابی کتب اپنے والد ماجد اور دیگر اساتذہ سے پڑھیں۔ بعد ازاں عصری علوم کے لیے ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج سے عربی میں ایم اے کیا۔ ان کے اساتذہ میں پروفیسر عبد القیوم، ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق اور سید ابو بکر غزنوی جیسے اہلِ علم شامل تھے۔ لاہور میں انھیں مولانا سید داؤد غزنوی کی صحبت سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے تدریس کا آغاز کیا اور کچھ عرصہ رحیم یار خان میں عربی کے لیکچرر رہے۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے، بطورِ لیکچرر وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں نائجیریا چلے گئے، جہاں وزارتِ تعلیم میں خدمات انجام دینے کے بعد ایک یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ ہوئے اور بعد ازاں اس شعبے کے سربراہ بھی مقرر ہوئے۔ نائجیریا میں انھیں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تدریس کا موقع ملا۔ اس قیام نے ان کے علمی افق کو مزید بلندی عطا کی۔ یوں انھیں افریقی مسلم معاشروں، ان کے دینی و سماجی حالات اور خصوصاً سکوٹو کی اصلاحی تحریک کے مطالعے کا موقع ملا۔ وہ سکوٹو کی تحریک کو عالمِ اسلام کی اصلاحی کوششوں کے

لیے ایک قابلِ مطالعہ تجربہ سمجھتے تھے۔

۱۹۸۵ء میں پاکستان واپس آگئے اور کچھ عرصہ تک اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے بھی وابستہ رہے۔ پھر انہوں نے لاہور کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ جب دارالسلام ریاض (سعودی عرب) نے لاہور (پاکستان) میں اپنی شاخ کھولی تو اس کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ یہاں انھوں نے مختلف علمی و تحقیقی منصوبے انجام دیے۔ صحیح مسلم کا اردو ترجمہ مع مختصر فوائد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو دارالسلام سے پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔ مزید برآں دارالسلام کے ''سیرت انسائیکلوپیڈیا'' کی ابتدائی جلدوں کی علمی نگرانی میں شریک رہے اور اس کے لیے ایک ۸۷ صفحات پر مشتمل مفصل مقدمۂ سیرت بھی تحریر کیا۔ دارالسلام لاہور کی مسجد میں کئی سال خطبۂ جمعہ بھی دیتے رہے۔ بعد میں انھوں نے صحیح مسلم کی ایک مفصل شرح بھی تیار کی، جو ان کی زندگی میں طباعت کے مرحلے تک نہ پہنچ سکی۔ بعد ازاں دارالسلام سے وابستہ الرحمۃ انسٹی ٹیوٹ، واربرٹن کی سرپرستی کی اور دینی و عصری تعلیم کے امتزاج کی کوششیں کیں۔

دارالمعارف، لاہور سے بھی ان کا گہرا علمی تعلق رہا۔ وہ تقریباً ۲۰۰۸ء سے وفات تک انجمن اہل حدیث لاہور کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ''دائرہ معارف سیرت محمد رسول اللہ ﷺ'' کی علمی نگرانی فرماتے رہے۔

مولانا محمد یحییٰ جلال پوری کا مزاج علمی و تحقیقی تھا۔ وہ قدیم دینی علوم کے ساتھ جدید سیاسی، سماجی اور ادبی مباحث سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی نثر صاف، شستہ، رواں اور عام فہم تھی۔ انھوں نے اخبارات میں کالم بھی لکھے اور پیغام ٹی وی کی علمی سرگرمیوں میں سرپرستی بھی کی۔

وہ خوش اخلاق، شائستہ، صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ رائے انسان تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تدریس، تحقیق، ترجمہ، خطابت اور علمی اداروں کی خدمت میں گزرا۔ آخری زمانے میں بیماری کے باعث کچھ عرصہ برطانیہ میں اپنے بچوں کے پاس مقیم رہے۔ ۱۰ ستمبر ۲۰۲۶ء کو مانچسٹر میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

مولانا محمد یحییٰ جلال پوری رحمہ اللہ کی شخصیت میں علم، تدریس، تحقیق، وسعتِ مطالعہ، شائستگی اور علمی اعتدال کی جو صفات جمع تھیں، وہ انھیں اپنے معاصر اہلِ علم میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی خدمات کا دائرہ کسی ایک کتاب یا ادارے تک محدود نہیں بلکہ مختلف علمی اور تحقیقی میدانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی یاد ان کے شاگردوں، متعلقین، علمی کاموں اور بالخصوص صحیح مسلم کے اردو ترجمے اور سیرت کے علمی منصوبوں کی صورت میں دیر تک باقی رہے گی۔

اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه۔ آمین۔

ائمۂ حدیث کا فقہی مسلک: اجتہاد یا تقلید؟

امام ابن تیمیہؒ سے دریافت کیا گیا کہ

"امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابو داؤد طیالسی، دارمی، بزار، دار قطنی، بیہقی، ابن خزیمہ اور ابو یعلیٰ موصلی، یہ حضرات مجتہد تھے اور کسی امام کی تقلید نہیں کرتے تھے، یا ان کا شمار مقلدین میں ہوتا تھا؟ نیز کیا ان میں کوئی ایسا بھی تھا جو امام ابو حنیفہ کے مذہب سے وابستہ ہو؟"

شیخ الاسلام نے جواب دیا:

"امام بخاری اور امام ابو داؤد کا تعلق ہے، تو یہ دونوں فقہ کے امام اور صاحبِ اجتہاد تھے۔

رہے امام مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابو یعلیٰ اور بزار وغیرہ، تو ان کا تعلق اہل حدیث کے مسلک سے تھا۔ یہ حضرات نہ کسی ایک عالم کی تقلید کے پابند تھے اور نہ ان کا شمار مطلق مجتہد ائمہ میں ہوتا تھا۔ البتہ ان کا رجحان ائمۂ حدیث کے اقوال کی طرف تھا، مثلاً امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق، امام ابو عبید اور ان جیسے دوسرے ائمہ۔ ان میں بعض حضرات کو کسی خاص امام سے خصوصی تعلق اور مناسبت بھی حاصل تھی، جیسے امام ابو داؤد کو امام احمد بن حنبل سے۔ مجموعی طور پر یہ حضرات اہل عراق، مثلاً امام ابو حنیفہ اور امام سفیان ثوری کے مذاہب کی بہ نسبت اہل حجاز، مثلاً امام مالک اور ان جیسے دوسرے ائمہ کے مذاہب کی طرف زیادہ میلان رکھتے تھے۔

جہاں تک ابو داؤد طیالسی کا تعلق ہے، تو وہ ان تمام حضرات سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ ان کا شمار یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن ہارون واسطی، عبد اللہ بن داؤد، وکیع بن جراح، عبد اللہ بن ادریس، معاذ بن معاذ، حفص بن غیاث اور عبد الرحمن بن مہدی جیسے ائمہ کے طبقے میں ہوتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس سے امام احمد بن حنبل کے شیوخ تعلق رکھتے تھے۔ یہ تمام حضرات سنت اور حدیث کی عظمت و اہمیت کے قائل تھے۔ تاہم فقہی رجحانات کے اعتبار سے ان میں فرق پایا جاتا تھا۔ بعض کا میلان اہل عراق کے مسلک کی طرف تھا، یعنی امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری وغیرہ کے مذاہب کی طرف، جیسے امام وکیع اور یحییٰ بن سعید۔ بعض دوسرے حضرات اہل مدینہ کے مسلک، یعنی امام مالک وغیرہ کے مذاہب کی طرف زیادہ مائل تھے، جیسے عبد الرحمن بن مہدی۔

رہے امام بیہقی، تو وہ امام شافعی کے مذہب پر تھے اور ان کے اکثر اقوال کی تائید و حمایت کرتے تھے۔

امام دار قطنی کا رجحان بھی امام شافعی اور ائمۂ سنت و حدیث کے مسلک کی طرف تھا، لیکن وہ امام شافعی کی تقلید میں اس درجے کے پابند نہ تھے جس درجے کے امام بیہقی تھے۔ اس کے باوجود امام بیہقی کو بھی بہت سے مسائل میں اجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا۔ البتہ امام دار قطنی کی اجتہادی قوت ان سے بڑھ کر تھی، کیوں کہ وہ علم و فقہ، دونوں اعتبار سے امام بیہقی پر فائق تھے۔" (ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ: 20/39 تا 41) [انتخاب: ڈاکٹر طاہر اسلام عسکری]

اعلان داخلہ
Session fall 2026

جامعۃ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ)

کے شعبہ المعهد العالي للعلوم الاجتماعية

لاہور انسٹیٹوٹ فار سوشل سائنسز
Lahore Institute For Social Sciences

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے الحاق شدہ

درس نظامی + 4 سالہ بی ایس اسلامک سٹڈیز

ریگولر کلاسز (برائے طلباء و طالبات)

عالیہ/بی اے کی سند کے حاملین کے لیے ڈائریکٹ 5th سمسٹر میں داخلہ جاری ہے۔

اہلیت: FSC, ICS, FA یا کسی بھی وفاق سے ثانویہ خاصہ کیا ہو۔

مدارس سلفیہ میں درس نظامی + وفاق المدارس اور ریگولر بی ایس اسلامک سٹڈیز کروانے والا پہلا ادارہ

اس وقت ادارہ میں بی ایس اسلامک اسٹڈیز کے 150 طلبہ وطالبات اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہیں۔

خصوصیات

- تعلیم کے ساتھ بہترین تربیت تاکہ علم کے ساتھ کردار بھی سنورے
- درس نظامی کے ساتھ ساتھ جدید عصری تعلیم کا حسین امتزاج
- بی ایس کی ڈگری جو تعلیمی و پیشہ ورانہ زندگی میں معاون ثابت ہو
- عربی زبان میں مہارت کے لیے خصوصی توجہ
- قرآن و حدیث کا گہرا فہم اور فقہی بصیرت
- آرام دہ پر سکون تعلیمی ماحول
- وسیع و عریض شاندار بلڈنگ

بمقام: ہیڈ آفس 91 بابر بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

الداعی
حافظ ڈاکٹر حمزہ مدنی
قائمقام رئیس جامعہ لاہور الاسلامیہ

0304 4328010
03224339822
03004011204

www.kitabosunnat.com magazine.mohaddis.com

CPL No. 49
Vol. 57 No. 6
Monthly MUHADDIS Lahore
35866476
35866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

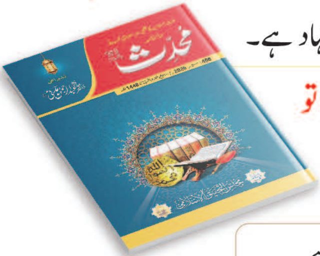

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

- قیمت فی شمارہ ۲۰۰ روپے
- زرِ سالانہ ۱۲۰۰ روپے

Designing: AK 0321-4966404

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore 54700